حیات وانقلاب مہدی موعودؑ پر دو پُر مغز مضامین

انتظارِ امامؑ

آیت اللہ سیّد محمد باقر الصدر شہید

آخری فتح

استاذ مرتضیٰ مطہّری شہید

جامعۃ علیمات اسلامی پاکستان

حیات وانقلاب مہدی موعودؑ پر دو پُر مغز مضامین

انتظارِ امامؑ

آیت اللہ سیّد محمد باقر الصدر شہید

آخری فتح

استاذ مرتضیٰ مطہّری شہید

جامعہ تعلیماتِ اسلامی پاکستان
پوسٹ بکس ۵۴۲۵ کراچی ۲

مترجم ——————— محمد فضل حق
نظر ثانی ——————— رضا حسین رضوانی
اصلاح و نظر ——————— کاظم علی گجراتی
سرورق ——————— محمود حسن، محمد حنیف
کتابت ——————— جعفر صادق، اشرف ندیم
طبع سوم ——————— سنہ ۱۴۰۹ھ - سنہ ۱۹۸۸ء
مطبع ——————— شاہین پیکجز کراچی

جملہ حقوق محفوظ : یہ کتاب کُلّی یا جُزوی طور پر اس شرط کے ساتھ فروخت کی جاتی ہے کہ راقم الحروف کی پیشگی اجازت حاصل کیے بغیر یہ موجودہ جلد بندی اور سرورق کے علاوہ کسی بھی شکل میں تجارت یا کسی اور مقصد کی خاطر نہ تو عاریتاً کرائے پر دی جائے گی اور نہ ہی دوبارہ فروخت کی جائے گی۔ علاوہ ازیں کسی آئندہ خریدار یا بطور عطیہ حاصل کرنے والے پر یہ شرط عائد نہ کرنے کے لیے بھی ایسی ہی پیشگی اجازت کی ضرورت ہوگی۔
وائی۔ کے۔ نفسی

اسلام

"کیا تم نے پوری طرح سمجھ لیا ہے کہ اسلام کیا ہے؟ یہ ایک ایسا دین ہے جس کی بنیاد حق و صداقت پر رکھی گئی ہے۔ یہ عِلم کا ایک ایسا منبع ہے جس سے عقل و دانش کی متعدّد ندّیاں پھوٹتی ہیں۔ یہ ایک ایسا چراغ ہے جس سے لاتعداد چراغ روشن ہوتے رہیں گے۔ یہ ایک ایسا بلند رہنما مینار ہے جو اللہ کی راہ کو روشن کرتا ہے۔ یہ اصُولوں اور اعتقادات کا ایک ایسا مجموعہ ہے جو صداقت اور حقیقت کے ہر متلاشی کو اطمینان بخشتا ہے۔

اے لوگو! جان لو کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو اپنی برترین خوشنودی کی جانب ایک شاندار راستہ اور اپنی عبودیّت اور عبادت کا بلندترین معیار قرار دیا ہے۔ اُس نے اسے اعلیٰ احکام، بلند اصولوں، محکم دلائل، ناقابلِ تردید تفوق اور مسلمہ دانش سے نوازا ہے۔

اب یہ تمھارا کام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اِسے جو شان اور عظمت بخشی ہے اسے قائم رکھو، اس پر خلوصِ دل سے عمل کرو، اس کے معتقدات سے انصاف کرو، اس کے احکام اور فرامین کی صحیح طور پر تعمیل کرو اور اپنی زندگیوں میں اسے اس کا مناسب مقام دو۔"

امام علی علیہ السلام

قارئین گرامی!

یہ کتاب ادارۂ جامعہ تعلیمات اسلامی کی مطبوعات میں سے ہے۔ ادارۂ ہذا کی مطبوعات کی اشاعت کا مقصد دورِ حاضر کی رُوحانی ضروریات کا پورا کرنا اور بالخصوص اسلامی طرزِ فکر کو اجاگر کرنا ہے۔

اِس ادارے نے اس بات کی پوری پوری کوشش کی ہے کہ فقط وہی مواد پیش کیا جائے جو مستند ہو۔ اس کتاب کی تیاری میں بھی یہی احتیاط برتی گئی ہے اور ایسی معلومات بھی شامل کی گئی ہیں جو بہت گراں قدر ہیں۔

آپ سے گزارش ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ اسی نقطۂ نگاہ سے کریں جس کے تحت یہ لکھی گئی ہے۔

آپ سے یہ بھی استدعا ہے کہ ہماری مطبوعات پر اپنی بے لاگ آراء تحریر فرما کر بھیجیں جو بڑی خوشی سے اور شکریے کے ساتھ قبول کی جائیں گی۔

دعوتِ اسلام کو فروغ دینا ایک ایسا کام ہے جس کی انجام دہی کے لیے ہم سب کو تعاون کرنا چاہیے۔ ادارہ آپ کو اس کارِ خیر میں شرکت کی دعوت دیتا ہے تاکہ اِس ارشادِ ربّانی کی تعمیل ہو سکے:

"(اے رسول ﷺ!) کہہ دیجیے: میں تمھیں بس ایک ہی نصیحت کرتا ہوں اور وہ یہ کہ اللہ کی خاطر اجتماعی یا انفرادی طور پر قیام کرو اور پھر غور کرو۔"

(سورۂ سبا۔ آیت ۴۶)

دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں آپ پر نازل ہوں۔

تعاون کا طلبگار

سکریٹری نشرواشاعت

کچھ اپنے بارے میں

حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید ابوالقاسم موسوی خوئی دام ظلہ العالی کی سرپرستی میں قائم ہونے والا یہ بین الاقوامی ادارہ جامعہ تعلیماتِ اسلامی دُنیا کے متعدد ممالک میں اسلامی علوم و معارف پر مشتمل معتبر اور مستند لٹریچر عوام تک پہنچانے میں کوشاں ہے۔

اِس ادارے کا مقصد دورِ حاضر کی روحانی ضروریات کو پورا کرنا، لوگوں کو اصلی اور محکم اسلامی علوم کی طرف متوجّہ کرانا اور اِس گراں بہا علمی سرمائے کی حفاظت کرنا ہے جو اہلبیتِ رسول ص نے ایک مقدس امانت کے طور پر ہمارے سپرد کیا ہے۔

یہ ادارہ اب تک اُردو، انگریزی، فرانسیسی، سندھی اور گجراتی زبانوں میں ۸۰ سے زیادہ کتابیں شائع کر چکا ہے جو اپنے مشمولات، اسلوبِ بیان اور طباعت کی خوبیوں کی بنا پر فردوسِ کتب میں ایک نمایاں مقام حاصل کر چکی ہیں۔ نشر و اشاعت کا یہ سلسلہ انشاء اللہ جاری رہے گا اور بھٹکی ہوئی انسانیت کو صراطِ مستقیم کی شناخت کرواتا رہے گا۔

اس کے علاوہ جامعہ کے زیرِ اہتمام چلنے والے ساٹھ سے زیادہ مدرسے گزشتہ سات برسوں سے قوم کے بچّے بچّیوں میں بنیادی اسلامی تعلیم کو عام کرنے میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان مدرسوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جائیگا۔

دعوتِ اسلام کو فروغ دینا ایک ایسا کام ہے جس کی انجام دہی کے لیے ہم سب کو تعاون کرنا چاہیے۔ ادارہ آپ سب کو اس کارِ خیر میں شرکت کی دعوت دیتا ہے تاکہ دینی تعلیمات کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جا سکے۔

دُعا ہے کہ خداوندِ منّان ہم سب پر اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل کرے!

تعاون کا طلبگار:

(شیخ) یوسف علی نفسی نجفی

وکیل حضرت آیت اللہ خوئی دام ظلہ العالی

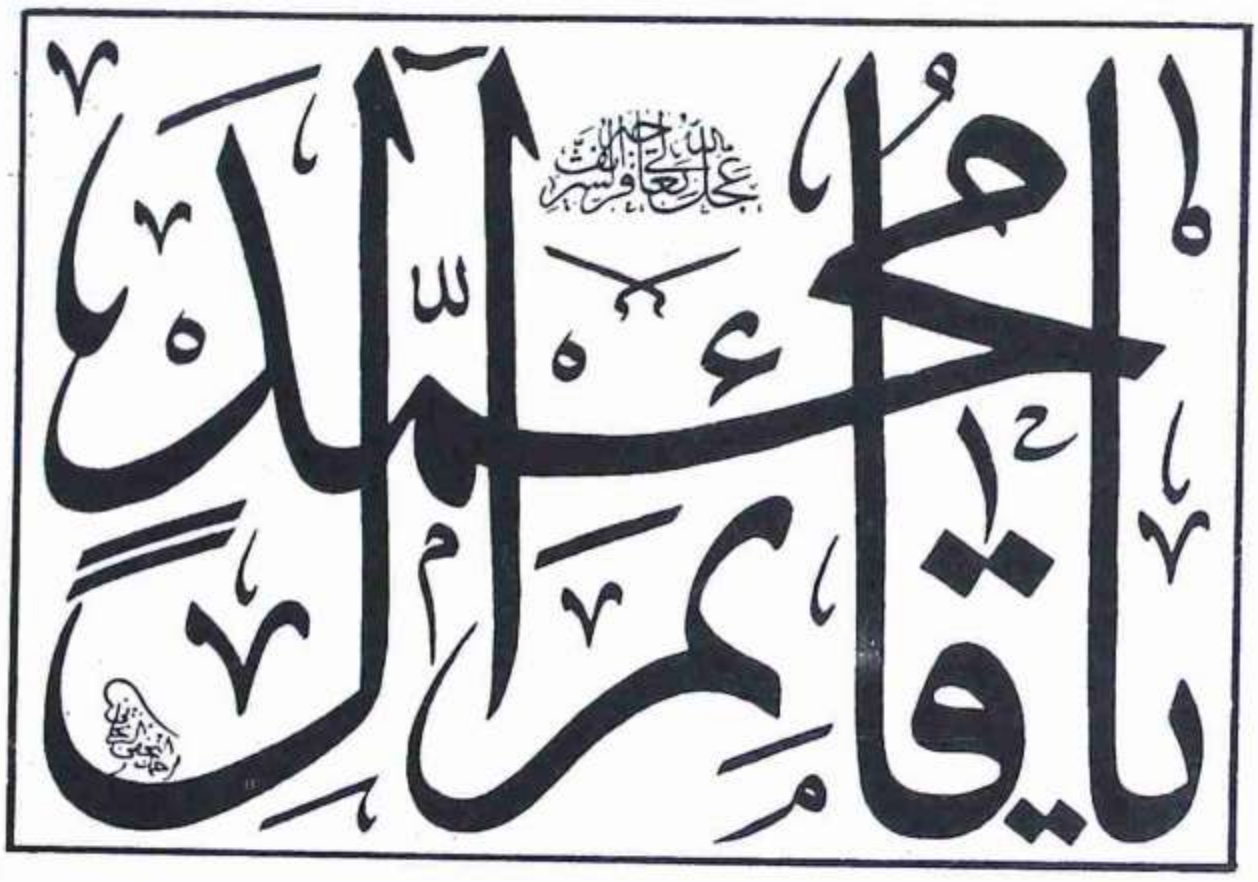
عجل الله تعالى فرجه الشريف
يا قائم آل محمد

انتظارِ امام

موضوعات

ابتدائیہ	۹
مہدیؑ کون ہیں	۲۲
مہدیؑ کی آفاقیت	۲۴
بعض اعتراضات اور شکوک	۲۸
اعتراضات کے جوابات	۳۳
مہدیؑ کی طولانی زندگی	
انکشافات اور ایجادات کے بارے میں اسلام کی پیشقدمی	
طبیعی قوانین کی معطلی	
معجزہ اور طویل عمر	
فلسفۂ طولِ عمر	
مہدیؑ کی زندگی کی سائنسی بنیاد	
مہدیؑ کی اپنے مشن کے لیے تربیت	
مسلسل زندگی کی وجوہات	
غیبت کے اسباب	
غیبتِ صغریٰ	
مہدیؑ کا مافوق البشر کردار	
مہدیؑ کے مشن کی تکمیل	

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابتدائیہ

بنی نوعِ انسان کی تاریخ میں مہدیؑ منتظر سے زیادہ مثالی شخصیت اور کوئی نہیں دیکھی گئی۔ واقعاتِ عالم کے تار و پود نے انسانی زندگی میں بڑے نفیس خاکے بُنے ہیں لیکن امام مہدی علیہ السّلام کا نمونہ ہر دوسرے نمونے سے برتر ہے۔ وہ تاریخ کے خیال پرستوں کی رویا اور دنیا کے تمام خواب دیکھنے والوں کا خواب رہے ہیں۔ وہ انسانیّت کی قطعی نجات کے لیے امّید کا قطبی ستارہ ہیں جس پر اُس کی نگاہیں جمی ہوئی ہیں۔

اسلام کی لازمی فتح کے بارے میں قرآنِ حکیم کی پیش گوئی امام مہدیؑ کے دوبارہ ظاہر ہونے پر پوری ہو گی۔ وہ بُرائی کے خلاف جنگ

کریں گے ۔ دنیا کے دُکھوں کا مداوا کریں گے اور ایک ایسا عالمی نظام قائم کریں گے جس کی بنیاد عدل وانصاف اور نیکی کی اسلامی تعلیمات پر ہو گی۔

یہاں اس امر کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا کہ ایک عالمی حکومت قائم کرنے کی تحریک جاری ہو چکی ہے اور بہت سے ممتاز دانشور اس مسئلے پر توجّہ دے رہے ہیں ۔ اقوام متّحدہ کا قیام اسی مقصد کے حصول کی جانب ایک کوشش ہے ۔ تاہم دنیا کے اتحاد کی ضرورت کے احساس کے باوجود اس منصوبے کی حیثیت ایک ایسے خواب جیسی ہے جس کی تعبیر ابھی بہت دُور ہے ۔ مخصوص مفادات، مختلف ممالک کی حکومتوں کے مابین رقابت اور مخالف بلاکوں کی باہمی عداوتیں اس مقصد کے حصول کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہیں لہٰذا یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ یہ مقصد خود بخود حاصل ہو جائے گا بلکہ اس کے لیے مہدی جیسے عالمی مصلح کی ضرورت ہو گی ۔ بہرحال اس کام کا آغاز ہو چکا ہے اور رفتہ رفتہ حالات وہی رُخ اختیار کر رہے ہیں جس کی پیش گوئی اسلام نے چودہ سو سال قبل کی تھی ۔

ایک متوقع مصلح اور انسانیت کے نجات دہندہ کا عقیدہ اہلِ تشیّع سے مخصوص نہیں ہے ۔ فقط تمام مسلمان فرقے ہی نہیں بلکہ دنیا

کے بڑے بڑے مذاہب مثلاً عیسائیت، یہودیت، بدھ مت اور زرتشتی مذہب بھی اس عقیدے کے حامل ہیں۔

امام مہدیؑ کے متعلق حقیقت کی تلاش کے بارے میں مختلف فرقوں، قوموں اور ملکوں میں کوئی فرق نہیں۔ جس طرح امام مہدیؑ خود آفاقی ہیں اُسی طرح ان کے بارے میں تلاش بھی آفاقی ہے وہ بڑی شان و شوکت کے ساتھ ان تنگناؤں سے بلند تر کھڑے ہیں جن میں انسانیت بٹی ہوئی ہے۔ وہ ہر ایک کے ہیں۔ لیکن مہدیؑ کی حقیقی ماہیّت کیا ہے؟ بلاشبہ یہ وہ اہم سوال ہے جو دنیا کا ہر غور و فکر کرنے والا شخص کرنا چاہے گا۔

یہ فقط اسلام ہی ہے جس نے اس تصوّر کو واقعیت بخشی ہے۔ مہدیٔ موعودؑ کو مستقبلِ بعید میں جنم نہیں لینا بلکہ وہ اب بھی ہم لوگوں کے درمیان زندہ موجود ہیں اور ہماری خوشیوں اور دکھ درد میں برابر کے شریک ہیں۔ ان کے ظہور سے فقط ایک اسلامی آرزو ہی پوری نہیں ہو گی بلکہ تمام عالمِ انسانیّت کی امّید بھی بر آئے گی۔

سوبورن یونیورسٹی (پیرس) کے شعبۂ فلسفہ کے رئیس ڈاکٹر ہنری کوربون کہتے ہیں:

"میرے نزدیک تشیّع ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے 'عقیدۂ امامت' کی بدولت 'انسان اور خدا' کے مابین 'الٰہی ھدایت' کا رابطہ برقرار رکھا ہے اور اسے دوام بخشا ہے۔ یہودیوں کے مطابق نبوّت جو انسان اور اللہ کے درمیان حقیقی رابطہ ہے حضرت موسیٰؑ کے ساتھ ختم ہوگئی۔ وہ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمدؐ کی نبوّت پر ایمان نہیں رکھتے۔ عیسائی بھی حضرت عیسیٰؑ سے آگے نہیں بڑھے۔ سُنّی فرقہ بھی حضرت محمدؐ کے ساتھ رُک گیا اور اُس نے یہ عقیدہ اپنایا کہ نبوّت کے خاتمے کے ساتھ انسان اور اللہ کے مابین رابطہ ختم ہو گیا ہے۔"

جب سے انسان نے عالمِ ہستی میں قدم رکھا ہے پروردگار عالم نے اسی آن سے اپنے برگزیدہ بندوں کے ساتھ رابطہ قائم رکھا ہے، نبیوں کا مبعوث کیا جانا اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ سلسلۂ نبوّت پیغمبرِ اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر آکر ختم ہونا تھا کیونکہ خداوند عالم کا ابدی پیغام اپنی مکمّل صورت میں آچکا تھا اور صرف حضرت محمد مصطفیٰؐ کا سینہ ہی اسرارِ الٰہیہ کا محفوظ خزینہ تھا لیکن چونکہ الٰہی ہدایت

قیامت تک کے لیے تھی اس لیے کسی نئے پیغام کی تو کوئی ضرورت نہ تھی البتہ اسی ابدی پیغام کا اپنی مکمّل صورت میں کسی امین سینے میں محفوظ رہنا ضروری تھا تاکہ زندۂ لامتناہی کا رابطہ زندۂ متناہی سے قائم و دائم رہے اور بلاشُبہ رسولِ اکرمؐ نے یہ بارِ امانت اپنے جانشین امام علی ابنِ ابی طالبؑ کے سپُرد کیا۔ یقیناً خدا اور اس کا رسولؐ بہتر جانتے ہیں کہ کون سا سینہ اس کے قابل تھا ؎

اے مذہبِ عشق را نمازے
اے سینۂ تو امینِ رازے

(اقبالؔ)

یہ اہلِ تشیّع ہی ہیں جن کا عقیدہ ہے کہ یہ رابطہ امام مہدیؑ کے ذریعے اب بھی قائم ہے اور ابدالآباد تک قائم رہے گا۔

اس امر کی تشریح کرنے کی کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ امام مہدیؑ منصبِ امامت سنبھالنے کے فوراً بعد کیوں غائب ہو گئے۔ بس اتنا کہنا کافی ہے کہ یہ دانا و بینا پروردگار کے حکم سے ہوا۔

دریں اثناء یہ تمام مسلمانوں اور بالخصوص شیعوں کا فرض ہے کہ عدالت، نیکی اور پرہیزگاری پر مبنی عالمی نظام کے قیام کے لیے مناسب فضا پیدا کرنے کی سرتوڑ کوشش کریں۔ اُنھیں چاہیئے کہ

وہ نہ صرف اپنی انفرادی زندگیاں اسلام کی تعلیمات اور اعلیٰ اقدار کے مطابق ڈھالیں بلکہ اجتماعی اور قومی سطح پر اسلامی نظام قائم کرنے کے لیے اپنی تمام کوششیں بروئے کار لائیں۔ انھیں چاہیئے کہ اپنی زندگیاں دین کی خدمت کے لیے وقف کر دیں اور اپنے آپ کو منجیٔ منتظر کے استقبال کے لیے تیار کریں۔ جب ائمہ اطہارؑ نے مسلمانوں کو امام مہدیؑ کا انتظار کرتے رہنے کا حکم دیا تو اس سے اُن کی مُراد یہی چیز تھی۔

ایک معتبر اور مسلمہ حدیث کے مطابق رسولِ اکرمؐ نے مختلف مواقع پر واضح طور ارشاد فرمایا کہ ہمارے بعد بارہ امام (ایک اور روایت کے مطابق بارہ امیر[1]/خلیفہ[2]) ہوں گے جن میں سے پہلے امام

---

[1] امیر۔ صحیح بخاری ص ۱۷۵، ط مصر ۱۳۵۵ھ

صحیح ترمذی۔ جلد ۲۔ ص ۴۵۔ ط دہلی ۱۳۴۲ھ

[2] خلیفہ۔ صحیح مسلم۔ جلد ۲۔ ص ۱۹۱۔ ط مصر ۱۳۴۸ھ

صحیح ابی داؤد۔ جلد ۲۔ ص ۲۰۷ ط مصر

مُسند احمد ابن حنبل۔ جلد ۵۔ ص ۱۰۶۔ ط مصر ۱۳۱۳ھ

مستدرک حاکم۔ جلد ۲۔ ص ۶۱۸۔ ط حیدرآباد دکن

تاریخِ بغداد۔ جلد ۱۴۔ ص ۳۵۳ (باقی صفحہ ۱۵ پر)

علیؑ ہوں گے اور آخری امام مہدیؑ ہوں گے۔

ایک اور معتبر حدیث کے مطابق آنحضرتؐ نے یہ فرما کر امام مہدیؑ کی نشاندہی کی ہے کہ وہ نویں پُشت میں امام حسینؑ کی اولاد ہوں گے۔

کچھ اور احادیث میں رسول اکرمؐ نے واضح الفاظ میں امام مہدیؑ کے مشن کا ذکر کیا ہے اور اُن کی غیبت اور دوبارہ ظہور سے متعلقہ واقعات بیان فرمائے ہیں۔

اس سلسلے میں یہ امر دلچسپی کا موجب ہے کہ جیسا کہ مشہور مؤرّخ طبری نے کہا ہے امام مہدیؑ کی غیبت کے متعلق روایات شیعہ محدّثین نے امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کی زندگی ہی میں (یعنی امام مہدیؑ کی ولادت سے تقریباً ۱۵۰ سال پہلے) اپنی کتابوں میں درج کر دی تھیں۔ یہ امر بجائے خود ان کی صحت کا واضح ثبوت ہے۔

امام مہدیؑ کے بارے میں وہ دوسرے حقائق جن کا پتا رسولِ اکرمؐ کی احادیث سے چلتا ہے مختصراً درجِ ذیل ہیں۔

(بقیہ صفحہ ۱۴ سے آگے)

منتخب کنز العمال۔ جلد ۵۔ ص ۳۱۲

ینابیع المودّہ۔ ص ۴۴۵۔ ط استنبول

(۱) اُن کا نام وہی ہوگا جو رسولِ اکرمؐ کا ہے۔

(۲) وہ کسی جابر فرمانروا کی بیعت نہیں کریں گے۔

(۳) وہ دنیا کو جب کہ وہ ناانصافی اور ظلم سے بھری ہوئی ہوگی عدل وانصاف سے معمور کر دیں گے۔

(۴) اپنے ظہور کے وقت وہ خانۂ کعبہ کی دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے ہوں گے۔ وہ اپنے ۳۱۳ حامیوں کو بلائیں گے جو ان کی آواز پر لبّیک کہتے ہوئے اُن کے اردگرد جمع ہو جائیں گے پھر وہ باجماعت نماز پڑھائیں گے۔

(۵) وہ ساری دنیا میں اسلامی قانون اور نظام نافذ کریں گے۔

(۶) ان کے دوبارہ ظہور پر حضرت عیسیٰؑ ان کی اقتدا میں نماز پڑھیں گے۔

اسلامی روایات کے مطابق حضرت عیسیٰؑ آسمان سے نزول فرمائیں گے اور امام مہدی کے مشن کی حمایت کریں گے۔ عیسائی اور یہودی ان کی زیارت کریں گے اور ان کے صحیح مقام کا اعتراف کریں گے۔ عیسائی حضرت عیسیٰؑ کی الوہیّت کا عقیدہ ترک کر دیں گے۔ قرآنِ مجید فرماتا ہے:

"اہلِ کتاب میں سے کوئی شخص ایسا نہ ہوگا جو (عیسیٰؑ)

کے مرنے سے قبل اُن پر ایمان نہ لائے اور قیامت کے
دن خود عیسیٰؑ ان کے خلاف گواہی دیں گے۔"

(سورۃ النساء آیت ۱۵۹)

ظاہر ہے اُس وقت حضرت عیسیٰؑ عیسائیت کے قانون کی پیروی نہیں کریں گے جو پہلے ہی منسوخ ہو چکا ہے بلکہ وہ امامِ وقت کی اقتدا کریں گے اور اسی بنا پر ان کے پیچھے نماز پڑھیں گے۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم سمیت حدیث کی مشہور کتابوں میں رسولِ اکرمؐ سے روایت کی گئی ہے کہ آپ نے فرمایا:

"اُس وقت تمھارا کیا ردِّ عمل ہوگا جب مریم کا بیٹا تمھارے درمیان اُترے گا اور تمھارا امام تمھیں میں سے ہوگا؟"

یہاں لفظِ امام سے مراد امام مہدیؑ ہیں۔ اس حدیث سے واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ جب دوبارہ دنیا میں آئیں گے تو امام مہدیؑ کی پیروی کریں گے۔

اِن اور دوسری بہت سی حدیثوں کے مطابق جو رسولِ اکرمؐ اور ائمہ اطہارؑ سے بعد میں آنے والی نسلوں تک پہنچی ہیں امام مہدیؑ شعبان المعظم ۲۵۵ھ کے وسط میں عراق کے شہر سامرہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کی والدہ ماجدہ کا نام نرجس خاتون تھا۔

آپ اپنے والد بزرگوار اور گیارہویں امام حضرت حسن عسکریؑ کی وفات پر پانچ سال کی عمر میں منصبِ امامت پر فائز ہوئے۔ اس کے بعد جلد ہی آپ لوگوں کی نظروں سے غائب ہو گئے۔ تاہم آپ نے اپنے نامزد کردہ نمائندوں کی معرفت اپنے پیروؤں سے رابطہ برقرار رکھا۔ غیبت کی یہ مدت جو ستر سال ہے غیبت صغریٰ کہلاتی ہے۔

اِس مدت کے دوران لوگ اپنے مسائل آپ کے نائبین کی معرفت آپ کی خدمت میں پیش کر سکتے تھے اور ان کے جواب حاصل کر سکتے تھے۔ غیبتِ صغریٰ کے بعد غیبتِ کبریٰ کا دور شروع ہوا جو اب تک جاری ہے۔ اس دوران میں آپ سے براہ راست رابطہ منقطع ہو چکا ہے۔

بہر حال جو لوگ اُس زمانے کے سیاسی حالات سے واقف ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ عباسی حکمران امام مہدیؑ کو اپنے اور اپنے خاندان کے لیے عظیم ترین خطرہ تصوّر کرتے تھے اور ہر قیمت پر انھیں اپنے راستے سے ہٹا دینا چاہتے تھے۔ لہٰذا اپنے آپ کو ان لوگوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ آپ لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو جائیں۔ ائمہ علیہم السّلام کے بہت سے اقوال اِس صورتِ حال

پر وضاحت سے روشنی ڈالتے ہیں۔

امام مہدیؑ زندہ ہیں۔ آپ مختلف مقامات پر تشریف لے جاتے ہیں اور دنیا کے حالات میں گہری دلچسپی لیتے ہیں۔ آپ مومنین کی مجالس میں اکثر شرکت فرماتے ہیں لیکن اپنی شخصیت کے اظہار سے اجتناب برتتے ہیں۔ آپ مقررہ دن کو دوبارہ ظاہر ہوں گے۔ اُس وقت آپ بدی کی قوتوں کے خلاف جنگ کریں گے۔ ایک عالمی انقلاب کی رہنمائی فرمائیں گے اور دنیا میں عدل و انصاف اور نیکی پر مبنی ایک نیا نظام قائم کریں گے۔

قرآنِ مجید نے کھلے الفاظ میں وعدہ کیا ہے کہ ایک دن ایسا آئے گا جب حق و انصاف کا بول بالا ہوگا اور حکومت صالح لوگوں کے ہاتھوں میں ہوگی۔ ہم یہاں متعلقہ آیات میں سے چند ایک کا ترجمہ نقل کرتے ہیں:

"اور ہم نے تو ذکر کے بعد یقیناً زبور میں لکھ دیا تھا
کہ روئے زمین کے وارث ہمارے صالح بندے ہونگے"

(سورۃ الانبیاء - آیت ۱۰۵)

"جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے اچھے کام کیے
اللہ نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ وہ یقیناً اُنھیں

روئے زمین پر اپنا نائب مقرّر کرے گا جس طرح
اُس نے ان لوگوں کو اپنا نائب بنایا جو اِن سے پہلے
گزر چکے ہیں اور وہ یقیناً ان کے لیے وہ دین قائم
کرے گا جو اُس نے ان کے لیے پسند کیا ہے۔"

(سورۃ النور۔ آیت ۵۵)

"یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اپنے مُنہ سے پھونک مار کر (پراپیگنڈے
کے ذریعے) اللہ کے نور کو بجھا دیں لیکن اللہ اپنے نور
کو مکمل کر کے رہے گا خواہ کفّار کتنا ہی برا مانیں۔
وہی تو ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور سچّے
دین کے ساتھ مبعوث کر کے بھیجا تاکہ اسے دوسرے
ادیان پر غالب کرے خواہ مشرکین کتنا ہی برا مانیں۔"

(سورۃ التوبہ۔ آیات ۳۲ اور ۳۳)

ان آیات سے واضح ہو جاتا ہے کہ بالآخر صالح لوگ دنیا کے
انتظام کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں سنبھالیں گے اور اسلام باقی
سب ادیان پر غالب آئے گا۔

زیرِ نظر کتاب آیت اللہ سید محمد باقر صدر کی فکری کاوشوں
کا نتیجہ ہے جو اپنے علم، تبحّر اور مؤثّر اسلوبِ بیان کی بنا پر بے حد

شہرت کے مالک ہیں۔ اس میں انھوں نے ان تمام شکوک اور اعتراضات کا جواب دیا ہے جو امام مہدیؑ کی زندگی، کردار، کم سنی میں منصبِ امامت پر فائز ہونے اور غیبت کے بارے میں غیر معتقد لوگوں کی جانب سے اٹھائے گئے ہیں۔

امید ہے کہ زیرِ نظر موضوع پر یہ عالمانہ کتاب قارئین کے ایمان کو جِلا بخشے گی اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے ذہنی تجسّس کی پوری تشفی کا موجب بنے گی۔

ناشر

مہدیؑ کون ہیں

مہدیؑ فقط اسلامی عقیدے کی تجسیم ہی نہیں بلکہ اُس آرزو کا نشان بھی ہیں جو تمام انسانیّت اپنے مختلف دینی عقائد کے باوجود اپنے دلوں میں لبسائے ہوئے ہے۔ وہ اس سبق آموز وجدان کی معیّن شکل بھی ہیں جس کی بدولت عالمِ انسانیّت اپنی مختلف دینی وابستگیوں کے باوجود ایک ایسے دن کے انتظار میں ہے جب آسمانی ادیان اپنے تمام مفہومات کے ساتھ اپنا انتہائی مقصد پالیں گے اور تاریخ کی راہ پر انسانیّت کا تھکا دینے والا سفر بالآخر امن اور سکون کی منزل پر تسلّی بخش طور پر ختم ہو جائے گا۔ متوقّع اچھے مستقبل کا یہ احساس انھیں لوگوں تک محدود نہیں جو مافوق الفطرت

مظاہر پر ایمان رکھتے ہیں بلکہ اس کی جھلک ان لوگوں کے نظریات اور عقائد میں بھی دکھائی دیتی ہے جو غیر محسوس اشیا کے وجود کے قطعی منکر ہیں۔ مثلاً Dialectical materialism جو تاریخ کی تعبیر تضاد کی بنیاد پر کرتا ہے یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ ایک دن ایسا آئے گا جب تمام تضاد دُور ہو جائیں گے اور دنیا میں صلح و آشتی کا دور دَورہ ہوگا۔ لہٰذا پتا چلتا ہے کہ یہ احساس جس کا تجربہ تمام دوسرے روحانی تجربوں کی طرح تاریخ کی تمام تر مدت میں ہو رہا ہے بنی نوع انسان کا وسیع ترین اور عام ترین روحانی تجربہ ہے۔

جب مذہب اس عام احساس کی تائید کرتا ہے اور زور دے کر کہتا ہے کہ بالآخر یہ دنیا ظلم و جور سے بھر جانے کے بعد عدل اور انصاف سے معمور ہو جائے گی تو وہ اسے حقیقی قیمت عطا کرتا ہے اور انسانیت کے آئندہ سفر کے لیے ایک واضح عقیدے میں تبدیل کر دیتا ہے۔ یہ عقیدہ محض تسکین کا نہیں بلکہ نیکی اور قوت کا ذریعہ بھی ہے۔ یہ نیکی کا ذریعہ ہے کیونکہ مہدیؑ پر اعتقاد کے معنی دنیا میں رائج ظلم اور زیادتی کے خاتمے کے ہیں اور یہ بے انتہا قوت کے حصول کا ذریعہ ہے کیونکہ حالات خواہ کتنے ہی ناگفتہ بہ کیوں نہ ہو انسان کے دل میں امید کی شمع روشن کرتا ہے۔

معیّنہ دن پر اعتقاد یہ ثابت کرتا ہے کہ عدل و انصاف کی قوّتوں کے لیے یہ ممکن ہے کہ ظلم اور زیادتی کی قوّتوں کا مقابلہ کریں اور ان پر غالب آکر ایک نئے عالمی نظام کو رواج دیں۔ بہرصورت ظلم خواہ کتنا ہی غلبہ اور وسعت حاصل کر لے یہ ایک غیر معمولی کیفیّت ہے اور بالآخر اس کا خاتمہ ضروری ہے۔ ع

'ظلم پھر ظلم ہے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے'

اپنے عروج پر پہنچنے کے بعد اس کے خاتمے کی توقّع ہر مظلوم فرد اور قوم کے اندر اس امر کی بہت بڑی امّید پیدا کر دیتی ہے کہ اب بھی حالات کو بدلنا ممکن ہے۔

مہدیؑ کی آفاقیّت

گو ایک نجات دہندہ کا تصوّر اسلام سے قدیم تر ہے اور اس کا پھیلاؤ امّتِ مسلمہ سے زیادہ ہے لیکن اسلام نے اس کے جو خدوخال تفصیل سے متعیّن کیے ہیں وہ اُن آرزوؤں کو زیادہ مکمل طور پر پورا کرتے ہیں جو ابتدائے تاریخ سے اس سے وابستہ کی گئی ہیں۔ وہ تمام زمانے کے مظلوم اور مقہور افراد کے

احساسات اور خواہشات سے زیادہ ہم آہنگ ہیں۔ یہ اسلام ہی ہے جس نے ایک مجرّد خیال کو ایک ٹھوس شکل دی ہے۔ اب اس بات کی ضرورت نہیں رہی کہ ایک اجنبی نجات دہندہ کا انتظار کیا جائے جو مستقبلِ بعید میں دنیا میں وارد ہو۔ نجات دہندہ پہلے سے موجود ہے اور اب ہمیں فقط اس دن کا انتظار کرنا ہے جب حالات اس کے ظہور کے متقاضی ہوں تاکہ وہ اپنا عظیم مشن شروع کرے۔

اب امام مہدیؑ محض ایک تصوّر نہیں ہیں اور نہ ہی وہ فقط ایک پیش گوئی ہیں۔ ہمیں ان کی ولادت کا انتظار کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ وہ پہلے سے ہی جسمانی طور پر زندہ موجود ہیں اور ہمیں اس بات کا انتظار ہے کہ وہ اپنے مشن کا آغاز کریں۔ وہ ایک تعیّن شدہ ہستی ہیں جو ہمارے درمیان ایک حقیقی انسان کی مانند رہ رہے ہیں اور ہماری امیّدوں اور مایوسیوں، خوشیوں اور غموں میں شریک ہوتے ہیں۔ وہ دنیا میں جو مظالم، زیادتیاں اور ناانصافیاں ہوتی ہیں سب دیکھتے ہیں اور کسی نہ کسی طرح خود بھی ان سے متاثّر ہوتے ہیں۔ وہ بڑی شدّت سے اس دن کا انتظار کر رہے ہیں جب وہ اس قابل ہوں گے کہ حاجتمندوں

اور مظلوموں کی مدد کر سکیں اور ظلم و ستم اور ناانصافی کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکیں۔

اگرچہ یہ عظیم پیشوا جن کا انتظار کیا جا رہا ہے ہمارے درمیان موجود ہیں اور اپنے ظہور کے لیے معیّنہ لمحے کے منتظر ہیں لیکن انھیں حکم دیا گیا ہے کہ نہ تو اپنی مہدویت کا اعلان کریں اور نہ ہی اپنا تعارف لوگوں سے کرائیں۔

ظاہر ہے کہ اسلامی خدوخال کے ساتھ مہدیؑ کا تصوّر مظلوموں اور نجات دہندہ کے درمیان فاصلے کو کم کر دیتا ہے اور خواہ انتظار کی مدّت کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو وہ تصوّر اِن دونوں کے درمیان ایک پُل تعمیر کر دیتا ہے۔

جب ہمیں یہ یقین کرنے کو کہا جاتا ہے کہ امام مہدیؑ ایک مخصوص شخص ہیں جو طبعی زندگی گزار رہے ہیں تو ہم سے یہ اعتقاد رکھنے کی توقّع بھی کی جاتی ہے کہ امام مہدیؑ کے ہاتھوں ہر قسم کے ظلم اور زیادتی کے مکمّل قلع قمع کا تصوّر قائدِ منتظر کی ہستی میں مجسّم ہو گیا ہے جو ظاہر ہوں گے اور حدیث کے مطابق کسی جابر فرمانروا کی بیعت نہیں کریں گے۔ ان پر ایمان کے معنی ہر قسم کے ظلم و ستم کے خاتمے پر ایمان رکھنے اور ان کا (یعنی امام مہدیؑ کا)

ساتھ دینے کے ہیں۔

احادیث بھی امام مہدیؑ کو ماننے والوں کو تاکید کرتی ہیں کہ اُن کے منتظر رہیں اور فَرَج (کشائش) کے امیدوار رہیں۔ اس کا مقصد مومنین اور امام مہدیؑ کے مابین ایک گہرا روحانی اور وجدانی تعلّق قائم کرنا ہے۔ ایسا تعلق قائم کرنا اس وقت تک ممکن نہیں ہوتا جب تک اس بات پر اعتقاد نہ رکھّا جائے کہ امام مہدیؑ پیدا ہو چکے ہیں اور ایک زندہ اور معاصر ہستی ہیں۔

پس ہمیں پتا چلتا ہے کہ ایک زندہ مہدیؑ کے تصوّر نے ایک متوقّع نجات دہندہ کے خیال کو ایک نئی قوت بخشی ہے یہ تصوّر ہر اُس شخص کے لیے مؤثّر قوّت اور تشفّی کا موجب ہے جو محرومی اور ناانصافی کا شکار ہے۔ ایسا شخص زیادتی کو ہر شکل میں مسترد کر دیتا ہے کیونکہ وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کا امام اور پیشوا محض مستقبل کا ایک خیال نہیں بلکہ ایک معاصر اور زندہ موجود ہے جو اس کی تکالیف میں اس کا شریک ہے اور اس کے دکھ درد کو محسوس کرتا ہے۔

تاہم چونکہ یہ تصوّر بعض لوگوں کے تخیّل اور ادراک سے ماورا ہے اس لیے انھوں نے مہدیؑ کے وجود کے خیال کے بارے

میں ہی منفی رویّہ اختیار کیا ہے۔

بعض اعتراضات اور شکوک

۱۔ لمبی عمر

وہ لوگ اس بات پر معترض ہیں کہ امام مہدیؑ گزشتہ دس صدیوں میں یکے بعد دیگرے کئی ایک نسلوں کے معاصر رہے ہیں اور جب تک وہ دوبارہ ظاہر نہیں ہوتے اس وقت تک جیتے رہیں گے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ اتنی مدّت زندہ رہیں اور قوانین فطرت سے متاثّر نہ ہوں جن کے مطابق ہر اس شخص کے لیے جو زندگی کے مختلف مراحل گزار کر بڑھاپے کی حدود میں داخل ہو جائے امام مہدیؑ کی مبیّنہ عمر سے کہیں پہلے مرجانا ضروری ہے چنانچہ وہ مُصِر ہیں کہ اتنی لمبی عمر حقیقت کے نقطۂ نگاہ سے ناممکنات میں سے ہے۔

۲۔ قوانین کی معطلی

وہ لوگ یہ بھی دریافت کرتے ہیں کہ آخر اللہ تعالیٰ اس

خاص شخص کی خاطر قوانین فطرت معطّل کرنے اور اسے اتنی طویل عمر دینے کا کیوں خواہش مند ہے ؟ کیا دنیائے انسانیّت ایک اور قابل رہنما پیدا نہیں کر سکتی ؟ یہ کام کسی ایسے پیشوا پر کیوں نہ چھوڑ دیا جائے جو معیّن دن سے کچھ مدّت پیشتر پیدا ہو اور دوسرے لوگوں کی طرح پلے بڑھے اور پھر اپنا فریضہ انجام دیتے ہوئے دنیا کو جو اس کے زمانے میں ظلم و ستم سے بھر چکی ہوگی عدل و انصاف سے معمور کر دے ۔

۳۔ تعلیم و تربیّت کا فقدان

وہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر یہ درست ہے کہ مہدیؑ ایک مخصوص شخص ہیں جو ائمّہ اہل بیتؑ میں سے گیارہویں امامؑ کے فرزند ہیں اور ۲۵۵ھ ہجری میں پیدا ہوئے اور ۲۶۰ھ ہجری میں جب ان کے والد کا انتقال ہوا تو وہ منصب امامت پر فائز ہوئے اور ان کی عمر صرف پانچ سال تھی تو یہ امر واضح ہے کہ اس صغر سنی میں وہ اپنے والدِ بزرگوار سے دینی اور ذہنی تعلیم و تربیّت حاصل نہیں کر سکتے تھے چنانچہ وہ لوگ دریافت کرتے ہیں کہ اپنی عظیم ذمے داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے وہ کیونکر آمادہ ہوئے ؟

۴۔ظہور میں تاخیر

وہ لوگ یہ بھی دریافت کرتے ہیں کہ اگر پیشوا اپنی عظیم ذمّے داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تیّار ہے تو سینکڑوں سال تک انتظار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔کیا جن انقلابات اور عظیم المیوں سے دنیا اب تک دوچار ہوئی ہے وہ اس بات کا کافی جواز مہیّا نہیں کرتے کہ امام مہدیؑ ظاہر ہو کر اپنے مشن کی ابتدار کر دیں؟

۵۔مہدیؑ کی مسلسل زندگی

وہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر بالفرض یہ بات تسلیم بھی کر لی جائے کہ خالص علمی نقطۂ نگاہ سے امام مہدیؑ کا وجود ممکن ہے، تب بھی سائنسی اور دینی ثبوت کے بغیر ان کے حقیقی وجود کو کیسے قبول کیا جاسکتا ہے؟

کیا یہ عقیدہ قبول کرنے کے لیے چند صحیح یا غیر صحیح روایات کافی ہیں؟

۶- مہدیؑ کا مافوق البشری کردار

جہاں تک مقرّرہ دن کو امام مہدیؑ کے کردار کا تعلّق ہے وہ لوگ سوال کرتے ہیں کہ ایک فردِ واحد دنیا میں اتنی عظیم اور زبردست تبدیلی کیونکر لا سکتا ہے؟

ان کے کہنے کے مطابق ایک فرد خواہ کتنا ہی عظیم کیوں نہ ہو نہ تو تاریخ ساز ہو سکتا ہے اور نہ ہی تاریخ کو ایک نیا رُخ دے سکتا ہے کیونکہ ایک تاریخی تبدیلی کے اصلی عوامل معاشرے میں موجود حالات اور تضادات ہوتے ہیں اور ایک شخص کی بڑائی بھی انھیں حالات سے جنم لیتی ہے۔

۷- مہدیؑ کا طریقِ کار

وہ لوگ یہ بھی پوچھتے ہیں کہ اب جب کہ بدی اور ظلم کی قوّتیں، تباہ کن آلات، سائنسی معلومات اور سیاسی، سماجی اور عسکری طاقت سے لیس ہیں وہ شخص اتنی عظیم تبدیلی لانے اور بدی کی ان قوّتوں پر فتح پانے کے لیے کون سے طریقے استعمال کرے گا؟

اعتراضات کا پس منظر

یہ ہیں وہ سوالات جو وقتاً فوقتاً کسی نہ کسی شکل میں پوچھے یا دہرائے جاتے ہیں۔ اِن کا محرّک ہمیشہ ذہنی تجسّس ہی نہیں ہوتا بلکہ ان کی کچھ نفسیاتی وجوہات بھی ہیں۔ اب یہ احساس عام ہے کہ دنیا کا موجودہ نظام اتنا طاقتور اور ناقابلِ تسخیر ہے کہ اس کا خاتمہ کرنا ممکن نہیں۔ یہ احساس شکوک و شبہات پیدا کرتا ہے اور مختلف سوالات کو جنم دیتا ہے۔ یہ انسان کو شکست پسندی اور احساسِ کمتری کی طرف راغب کرتا ہے اور وہ ایک ایسی عالمگیر تبدیلی کے بارے میں سوچ کر ہی کانپ جاتا ہے جو ظلم اور تاریخی تضادات کا خاتمہ کر کے انصاف اور صداقت پر مبنی ایک نظام بروئے کار لائے گی۔ یہ ذہنی مایوسی کسی نہ کسی بنا پر اُسے کسی ایسی تبدیلی کے بارے میں شک کرنے اور اس کے امکان کو مسترد کرنے پر اُکساتی ہے اور وہ اس شک کا اظہار بار بار ایسے سوالات کے ذریعے کرتا ہے۔

اب ہم مذکورہ بالا سوالات کو یکے بعد دیگرے لے کر مختصر بحث کریں گے۔

اعتراضات کے جوابات

۱۔ امام مہدیؑ کی طولانی زندگی

کیا ایک انسان کے لیے کئی صدیوں تک زندہ رہنا ممکن ہے جیسا کہ اس پیشوائے منتظر کے بارے میں کہا جاتا ہے جسے زندہ رہتے ہوئے ۱۱۴۰ سال سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا ہے ؟ یہ مدّت ایک عام انسان کی زندگی کے مقابلے میں جو بچپن سے بڑھاپے تک کے تمام مراحل سے گزرتا ہے تقریبًا چودہ گنا ہے۔

جو چیز موردِ اعتراض ہے وہ اتنی طویل عمر کا امکان ہے آئیے اِس اعتراض پر ذرا غور سے نگاہ ڈالیں۔ یہاں (بعض دوسری حقیقتوں کی طرح) 'امکان' کے لفظ کا استعمال نسبی ہے۔ یہ اسی وقت بامعنی ہو سکتا ہے جب اس کا تعلّق کسی شخص جگہ یا وقت سے ہو۔ یہ ضروری نہیں کہ جو چیز ایک شخص کے لیے ناممکن ہے وہ دوسروں کے لیے بھی ناممکن ہو۔ پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو چیز ایک جگہ ناممکن ہے وہ دوسری جگہ ممکن ہو۔ یا یہ کہ جو چیز ایک وقت پر ممکن نہ ہو وہ دوسرے

وقت پر ممکن ہو جائے ۔ لفظ 'امکان' کے نسبی ہونے کے بارے میں لاتعداد مثالیں دی جاسکتی ہیں۔

دوسرے الفاظ میں کسی چیز کے امکان کی تین شکلیں ہو سکتی ہیں :

۱۔ حقیقی امکان ۔

۲۔ سائنسی امکان ۔ اور

۳۔ منطقی امکان ۔

سمندری سفر کرنا، سمندر کی تہہ تک پہنچنا اور چاند کی سطح پر جا اُترنا عملی امکانات ہیں ۔ کئی ایک اشخاص نے یہ کام کسی نہ کسی صورت میں انجام دیے ہیں۔

سائنسی امکان سے مُراد یہ ہے کہ بعض کام ایسے ہو سکتے ہیں جنھیں گو موجودہ حالات میں عملی شکل دینا ممکن نہ ہو لیکن مساعد حالات میں ان کے امکان پذیر ہونے سے انکار کی کوئی سائنسی وجہ بھی موجود نہ ہو اور سائنسی رجحانات سے اندازہ ہو جائے کہ کبھی نہ کبھی ان کاموں کا کرنا ممکن ہو جائے گا ۔ مثلاً انسان کے سیّارہ زہرہ تک سفر کر سکنے کے امکان کو رَد کرنے کی کوئی سائنسی وجہ موجود نہیں ۔ گو اب تک کوئی شخص اس سیّارے

پر نہیں پہنچ سکا ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ چاند پر اُترنے اور زہرہ پر اُترنے میں فقط درجے کا فرق ہے اور چونکہ زمین سے زہرہ کا فاصلہ زمین سے چاند کے فاصلے سے زیادہ ہے اس لیے سوال فقط کچھ مزید مشکلات پر قابو پانے کا ہے لہٰذا سائنسی لحاظ سے زہرہ پر پہنچنا ممکن ہے گو عملی لحاظ سے یہ ابھی تک ناممکن ہے۔

اس کے برعکس سورج پر پہنچنا سائنسی لحاظ سے بھی ناممکن ہے کیونکہ عقل اور تجربے کی رو سے انسان اس بات کا تصوّر بھی نہیں کرسکتا کہ مثلاً ایک ایسا لباس تیّار کرے جو اُسے سورج کی خوفناک گرمی سے محفوظ رکھ سکے۔

منطقی امکان کے معنی یہ ہیں کہ بعض واضح قوانین کی بنا پر انسانی عقل ایک چیز کو ناممکن قرار نہ دے۔ مثلاً منطقی لحاظ سے تین نارنگیوں کا دو برابر حصّوں میں تقسیم کرنا اس وقت تک ناممکن ہے جب تک ان میں سے ایک کو کاٹا نہ جائے۔ یہ امر واضح ہے کہ تین چونکہ طاق ہندسہ ہے اس لیے اسکو دو صحیح اعداد میں تقسیم کرنا ناممکن ہے۔ فقط ایک جفت ہندسے کا ہی اس طرح تقسیم کرنا ممکن ہے اور ایک ہندسہ بیک وقت جفت اور طاق

نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کا مطلب تناقض بالذّات ہوگا جو کہ ناممکن ہے۔ تاہم ایک انسان کا آگ میں داخل ہونا اور اسے کوئی ایذا نہ پہنچنا یا سورج پر جانا اور اس کی گرمی سے متاثر نہ ہونا منطقی طور پر محال نہیں کیونکہ یہ فرض کرنا متناقض بالذّات نہیں کہ حرارت ایک زیادہ حرارت رکھنے والے جسم سے ایک کم حرارت رکھنے والے جسم میں منتقل نہ ہو۔ حالانکہ یہ فرض کرنا ہمارے گزشتہ تجربوں کے خلاف ہے جنھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ اگر دو اجسام کو متّحد کر دیا جائے تو حرارت زیادہ حرارت رکھنے والی چیز سے کم حرارت رکھنے والی چیز کی جانب منتقل ہوتی رہے گی حتّٰی کہ دونوں کا درجۂ حرارت یکساں ہو جائے۔

لہٰذا پتا چلتا ہے کہ منطقی امکان کی وسعت سائنسی امکان سے زیادہ ہے اور سائنسی امکان کی وسعت عملی امکان سے زیادہ ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک شخص کا ہزاروں سال تک زندہ رہنا منطقی طور پر ناممکن نہیں کیونکہ اس میں کوئی غیر معقولیّت یا تناقض بالذّات موجود نہیں۔ زندگی بذاتِ خود اس بات پر دلالت نہیں کرتی کہ انسان جلدی مرجائے۔

اِتنی طویل زندگی مسلّمہ طور پر اتنی عملی چیز نہیں جتنا سمندر کی تہہ تک غوطہ لگانا یا چاند پر پہنچنا ہے۔ موجودہ سائنسی وسائل کے ذریعے اب تک انسانی زندگی کو سینکڑوں برس تک بڑھانا ممکن نہیں ہوا۔ حتّٰی کہ وہ لوگ بھی جنھیں جدید ترین وسائل میسّر ہیں اور جو زندہ رہنے کے بے حد شائق ہیں طبعی زندگی ہی گزارتے ہیں۔

جہاں تک طویل عمر کے سائنسی امکان کا تعلّق ہے کوئی ایسی چیز موجود نہیں جو نظریاتی لحاظ سے اس سے انکار کو جائز قرار دے سکے۔ درحقیقت اس معاملے کا تعلّق کہن سالی کی عِلمِ عضویات کے مطابق تشریح سے ہے۔

سوال یہ ہے کہ آیا "بڑھاپا اور فرسودگی" ایک ایسے طبیعی قانون کی پیداوار ہے جو انسانی پیکر کے خلیوں پر حاکم ہے اور جس کے مطابق یہ ضروری ہے کہ اپنی نشو ونما کے آخری مرحلے پر پہنچ کر بدن آہستہ آہستہ فرسودہ ہونے لگے اور زندگی جاری رکھنے کے لیے اس کی صلاحیّت کم ہو جائے حتّٰی کہ ایک موقع پر وہ کام کرنا چھوڑ دے اور کیا یہ قانون اس بدن پر بھی صادق آتا ہے جو ہر قسم کی بیرونی تاثیر سے الگ تھلگ رہا ہو۔ یا یہ کہ بدن کے

خلیوں میں جو فرسودگی اور ان کی صلاحیتوں میں جو کمی واقع ہوتی ہے، وہ بیرونی عوامل مثلاً جراثیم اور زہریلے مادوں سے مقابلے کے نتیجے میں ہوتی ہے جو انسانی بدن تک پہنچتے ہیں۔

یہ وہ سوال ہے جس سے سائنس اس وقت دست و گریبان ہے اور اس کا جواب تلاش کرنے کی انتہائی کوشش کر رہی ہے۔ اس وقت کبر سنی کی ایک سے زیادہ سائنسی توجیہیں کی جاتی ہیں۔ بہر حال اگر ہم یہ رائے تسلیم کرلیں کہ کبر سنی کا انحطاط بیرونی اثرات کی وجہ سے ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر انسانی جسم کے خلیوں کو ان مخصوص اثرات سے الگ کرلیا جائے تو علمی لحاظ سے زندگی کو طویل کرنا، کبر سنی کو ملتوی کرنا بلکہ بالآخر اس پر قابو پا لینا ممکن ہوگا۔

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ زندہ خلیوں پر ایک ایسے طبیعی قانون کا اطلاق ہوتا ہے جس کے مطابق خود ان کے اندر قوّت کے مکمّل طور پر سلب ہو جانے کے بیج موجود ہوتے ہیں۔ وہ اپنا قدرتی راستہ طے کرتے ہوئے بڑھاپے اور ضعیفی کے مراحل سے گزرتے ہیں اور بالآخر اپنا کام انجام دینا چھوڑ دیتے ہیں۔

اگر ہم یہ نظریہ تسلیم بھی کرلیں تب بھی اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس طبیعی قانون میں کوئی لچک نہیں ہے۔ درحقیقت اسے

ایک لچکدار قانون تصوّر کیا جاتا ہے کیونکہ ہم روزمرّہ کی زندگی میں دیکھتے ہیں اور تجربہ گاہوں میں سائنسی مشاہدات نے بھی اس امر کی تائید کی ہے کہ کبرِسنی ایک عضویاتی مظہر ہے جس کا 'وقت' سے کوئی تعلّق نہیں۔ اور وہ ان معنوں میں کہ یہ مرحلہ کبھی جلدی آتا ہے اور کبھی بہت دیر سے آتا ہے۔ یہ عام مشاہدے کی بات ہے اور اطبّا بھی اس کی تائید کرتے ہیں کہ بہت سے لوگ جن کی کافی عمر ہوتی ہے توانا بدن کے مالک ہوتے ہیں اور ان میں بڑھاپے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ یہ اس طبیعی قانون کے لچک دار ہونے کی وجہ سے ہی ہے کہ سائنسدان ایسے حالات پیدا کر کے جو کبرِسنی میں تاخیر کر دیتے ہیں مصنوعی طور پر بعض جانوروں کی عمریں ان کی طبیعی عمروں سے سینکڑوں گنا طویل تر کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔[1]

---

[1] ہزاروں سال سے انسان کی یہ آرزو ہے کہ موت کی آمد میں، جو ایک اٹل حقیقت ہے، تاخیر کر دے۔ گزشتہ صدیوں میں اس مقصد کے حصول کی خاطر کیمیا دانوں نے اکسیرِ حیات ایجاد کرنے کی کوششیں کیں لیکن ان کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

انیسویں صدی کے آخر میں سائنسی ترقّی کی بنا پر زندگی کے زیادہ طویل ہو سکنے کی امید ایک دفعہ پھر بندھی اور ممکن ہے کہ مستقبل قریب میں یہ خواب

(باقی صفحہ ۴۰ پر)

ان سائنس دانوں نے غیر معمولی کامیابیاں حاصل کرکے طبعی بڑھاپے کے قانون کو توڑ دیا ہے اور سائنسی نقطۂ نگاہ سے ثابت

(بقیہ صفحہ ۳۹ سے آگے) حقیقت میں بدل جائے۔

اس سلسلے میں سائنس دانوں نے سب سے پہلے حیوانوں پر تجربے کیے مثلاً کورنیل یونیورسٹی کے ممتاز ماہرِ فن "مک کی" نے اور لندن یونیورسٹی کے ایلکس کمفرٹ نے غذا اور بڑھاپے کے مابین تعلق کے بارے میں تجربات انجام دیے۔

ایلکس کمفرٹ اپنے تجربوں کے نتیجے میں کچھ چوہوں کی عمر میں پچاس فی صد بڑھانے میں کامیاب ہو گئے۔

ایک اور امریکی ماہر رچرڈ ہائفس چائلڈ نے "دی بیتل آمینو۔ اتانول" استعمال کر کے چوہوں کی عمر میں اضافہ کیا۔ اس کی چار سالہ تحقیقات کے نتائج ۱۹۷۲ء کے موسم بہار میں منظرِ عام پر آئے۔

یہ سائنس داں اور اس کا ساتھی اکیپ اس نتیجے پر پہنچے کہ "دی مینل آمینو۔ اتانول" تجربات کی مدت میں چوہوں کی عمر ۶ تا ۴۹ فیصد بڑھ گئی اور مچھروں میں عمر کے طویل ہو جانے کی شرح ۳۰۰ فی صد تک پہنچ گئی۔

(بحوالہ روزنامہ رستاخیز۔ ایران شمارہ ۸۳۵-۸۳۱

کر دیا ہے کہ بڑھاپے کو موخّر کر دینا یا اس کے لیے مواقع پیدا کرنا ایک ایسی چیز ہے جو سائنس کی رُو سے ممکن ہے اور اگر دورِ حاضر کی سائنس دوسرے جانداروں کی طرح انسان کے بارے میں اس پروگرام پر عمل نہیں کر سکتی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان پر تجربات کرنے کے لیے دوسرے حیوانات کے مقابلے میں بہت سی دشواریاں حائل ہیں۔

لہٰذا سائنس اپنی قدم بقدم تحقیق سے اس امر کی نشان دہی کرتی ہے کہ علمی نقطۂ نگاہ سے انسان کی عمر لمبی ہونے کے امکان کے خلاف کوئی دلیل پیش نہیں کی جا سکتی۔ خواہ ہم بڑھاپے کو اس نظریے سے دیکھیں کہ وہ جسم کے بیرونی عوامل سے مقابلے اور ان سے متاثر ہونے کا نتیجہ ہے اور یا یہ کہیں کہ یہ ایک ایسے طبیعی قانون کا نتیجہ ہے جو زندہ موجودات میں پوشیدہ ہے اور انھیں موت اور نیستی کی جانب کھینچتا ہے۔

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے اس کی روشنی میں ہم امام مہدیؑ کی طویل عمر کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس بارے میں جو اعتراضات کیے گئے ہیں اور جن باتوں پر تعجّب کا اظہار کیا گیا ہے ان کا جواب دے سکتے ہیں۔ جب یہ بات طے ہو گئی کہ علمی اور منطقی

لحاظ سے طویل عمر ممکن ہے اور ہمیں یہ بھی پتا چل گیا کہ سائنس دان اس علمی امکان کو عملی امکان میں بدلنے کی کوشش کر رہے ہیں تو پھر امام مہدیؑ کی طویل عمر کے بارے میں تعجّب کرنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی بجز اس کے کہ امام کے علم پر شک کیا جائے اور اس بات کو ناممکن سمجھا جائے کہ وہ بنی نوعِ انسان کی علمی پیش رفت پر سبقت حاصل کر سکتے ہیں۔

اس مظہر کا موازنہ سرطان یا دماغی جریانِ خون کے اس علاج سے کیا جا سکتا ہے جو سائنس کے ان امراض کا علاج دریافت کرنے سے پہلے دریافت ہو جائے۔

انکشافات اور ایجادات کے بارے میں اسلام کی پیش قدمی

اگر یہ سوال کیا جائے کہ اس رہنما کی زندگی کی حفاظت کی خاطر اسلام نے سائنس پر کیسے سبقت حاصل کر لی تو اس کا جواب سہل ہے۔ صرف یہی ایک میدان نہیں جس میں اسلام نے سائنس کے مقابلے میں پہل کی ہے۔ پوری کی پوری اسلامی شریعت نے سائنسی تحریک اور انسانی فکر کی فطری ترقی پر کئی صدیوں کی

سبقت حاصل کی۔ اسلام نے عملی اطلاق کے لیے ایسے قانون پیش کیے جنھیں سائنس نے صدیوں کی کاوش کے بعد دریافت کیا۔ اس نے ایسے اصول وضع کیے جن کی حکمت کی تصدیق سائنس نے ابھی حال ہی میں کی ہے۔ اس نے کائنات کے ایسے رازوں پر سے پردہ اٹھایا جنھیں اُس وقت کوئی نہیں جانتا تھا اور جن کی صحت کی بعد میں سائنس نے توثیق کی۔ اگر ہم ان باتوں کو تسلیم کر لیں تو پھر ربِّ جلیل کے لیے یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے کہ امام مہدیؑ کو دنیا کے علم پر سبقت دلا دے۔

یہاں ہم نے اسلام کی سائنس پر سبقت کے فقط انھیں پہلوؤں کا ذکر کیا ہے جنھیں ہم براہِ راست سمجھ سکتے ہیں۔ ہم اِن میں اُن واقعات کا اضافہ بھی کر سکتے ہیں جن تک سائنس تاحال رسائی حاصل نہیں کر سکی مثلاً کلام اللہ (قرآنِ مجید) نے ہمیں بتایا ہے کہ ایک رات رسولِ اکرمؐ کو مسجد الحرام سے (جو مکّہ میں واقع ہے) مسجد الاقصیٰ لے جایا گیا (جو یروشلم میں واقع ہے) فطری قوانین کے مطابق یہ شبانہ سفر اتنی تیز رفتاری سے طے کیا گیا جسے سائنس نے سینکڑوں سال بعد ممکن قرار دیا ہے۔ جس علمِ الٰہی نے سائنس کے، رفتار

پر، دسترس پانے سے پہلے رسولِ اکرمؐ کو اتنی تیز رفتار عطا کی اُسی نے منجانبِ الٰہی مقرّر کردہ آنحضرتؐ کے آخری جانشین کو اتنی لمبی عمر عطا کی جسے سائنس اب تک عملی شکل نہیں دے سکی۔

طبیعی قوانین کی معطّلی

اس میں کوئی کلام نہیں کہ جہاں تک عام مشاہدے اور اِن تجربات کا تعلّق ہے جو سائنس دانوں نے کیے ہیں منجیٔ منتظر کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا کردہ طویل عمر ایک غیر معمولی چیز معلوم ہوتی ہے لیکن ان کا نظامِ عالم کو یکسر تبدیل کرنے اور اسے عدل اور صداقت کی بنیاد پر نئے سرے سے ترتیب دینے کا کردار بھی اتنا غیر معمولی ہے کہ نہ تو لوگ اس سے آشنا ہیں اور نہ ہی تاریخ میں اس کا تجربہ کیا گیا ہے۔ لہٰذا اگر تمہیدی مرحلے پر بھی ان کے مشن کی ابتدا سے پہلے ان کی طویل عمر جیسے غیر معمولی واقعات پیش آئیں تو یہ کوئی تعجّب کی بات نہیں۔ بہرحال یہ واقعات خواہ کتنے ہی غیر مانوس کیوں نہ ہوں یہ اس عظیم کردار سے زیادہ غیر معمولی نہیں جو امام مہدیؑ کو معیّنہ

دن کو ادا کرنا ہے۔ اگر ہم ان کا وہ کردار قبول کر سکتے ہیں جس کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم ان کی طویل عمر کو قبول نہ کریں جو ہماری عام طبعی زندگی میں بے مثال چیز ہے۔

ہمیں معلوم نہیں کہ آیا یہ ایک اتّفاقی امر ہے کہ جن دو بزرگواروں نے انسانی تہذیب کی تمام خرابیوں سے تطہیر اور دنیا کی تعمیرِ نو کا بیڑا اُٹھایا ان میں سے ہر ایک نے بڑی طویل عمر پائی جو انسان کی عام عمر سے کئی گنا زیادہ ہے۔ ان میں سے ایک نے اپنا کردار زمانۂ گزشتہ میں ادا کیا۔ وہ حضرت نوح علیہ السّلام تھے جن کے متعلّق قرآنِ مجید نے واضح الفاظ میں فرمایا ہے کہ وہ ۹۵۰ سال تک اپنی قوم کے درمیان رہے۔ انھوں نے طوفان کے بعد دنیا کی تعمیرِ نو کی۔ دوسری بزرگوار ہستی جس کو اپنا کردار مستقبل میں ادا کرنا ہے امام مہدیؑ کی ہے جو ایک ہزار سال سے زیادہ مدّت سے ہمارے درمیان رہ رہے ہیں اور جنھیں معیّنہ دن کو اپنا کردار ادا کرنا ہے اور دنیا کو نئے سرے سے تعمیر کرنا ہے۔

اب یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم حضرت نوحؑ کا تقریباً ایک ہزار سال تک زندہ رہنا تو تسلیم کر لیں لیکن امام مہدیؑ کی طویل عمر کو قبول نہ کریں؟

معجزہ اور طویل عمر

جیسا کہ ہم نے گزشتہ صفحات میں ثابت کیا ہے کہ سائنس کی رو سے طویل عمر ممکن ہے۔ تاہم فرض کیجیے کہ یہ قول درست نہیں اور کہن سالی کا قانون اٹل ہے اور اس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ پھر اس صورتِ حال کے کیا معنی ہیں؟ اس کے معنی فقط یہ ہیں کہ حضرت نوحؑ اور حضرت مہدیؑ کی طرح صدیوں تک زندہ رہنا ان طبیعی قوانین کے خلاف ہے جو سائنس نے تجربے اور تحقیق کے جدید طریقوں کے مطابق قائم کیے ہیں۔

اِس صورت میں طویل زندگی کو 'معجزہ' کہا جا سکتا ہے جو ایک مخصوص حالت میں ایک طبیعی قانون کو معطّل کر دیتا ہے تاکہ ایک ایسے شخص کی زندگی کا تحفّظ کیا جا سکے جسے ایک آسمانی مشن سونپا گیا ہو۔ مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق جس کی بنیاد قرآنِ مجید اور سنّتِ رسولؐ پر ہے ایک ایسا معجزہ نہ تو بذاتِ خود ایک انوکھی چیز ہے اور نہ ہی حیرت انگیز ہے کیونکہ 'بڑھاپے' کے قانون کے مقابلے میں حرارت کے تبادلے کا قانون (جس کے مطابق حرارت زیادہ حرارت والی چیز سے کم حرارت والی چیز کی طرف منتقل ہو جاتی ہے)

کچھ کم قطعی نہیں ہے لیکن اس کے باوجود جب حضرت ابراہیمؑ کو جلتی آگ میں پھینکا گیا تو یہ قانون انھیں محفوظ رکھنے کے لیے معطل کر دیا گیا کیونکہ اُن کی زندگی بچانے کا یہی واحد طریقہ تھا۔

قرآنِ مجید فرماتا ہے:

"ہم نے کہا: اے آگ! تو ابراہیم پر بالکل ٹھنڈی اور سلامتی کا باعث ہو جا۔" (سورۃ الانبیاء۔ آیت ۶۹)

چنانچہ حضرت ابراہیمؑ کوئی تکلیف اٹھائے بغیر آگ سے باہر آگئے۔ اس کے علاوہ بھی کئی دفعہ انبیائے کرام اور اللہ تعالیٰ کے دوسرے برگزیدہ بندوں کی حفاظت کی خاطر طبیعی قوانین معطل کیے گئے۔ حضرت موسیٰؑ کے لیے سمندر میں شگاف ڈال دیا گیا۔ رومیوں نے یہ سمجھا کہ انھوں نے حضرت عیسیٰؑ کو گرفتار کر لیا ہے حالانکہ حقیقت مختلف تھی۔ حضرت محمدؐ ایسے حالات میں گھر سے نکلے کہ قریش کے ایک گروہ نے ان کے مکان کا محاصرہ کر رکھا تھا اور انھیں قتل کر دینا چاہتے تھے۔ جب آپ ان لوگوں کے درمیان سے گزرے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کی نظروں سے اوجھل کر دیا اور وہ آپ کو نہ دیکھ سکے۔

ان تمام مواقع پر اللہ تعالیٰ نے ان اشخاص کی خاطر

طبیعی قوانین معطّل کر دیے جن کی جانیں وہ محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ کبرسنی کا قانون بھی ایسے ہی قوانین میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس سے ہم یہ عام نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ جب کبھی اللہ کے کسی برگزیدہ بندے کی زندگی کی حفاظت ضروری ہوتا کہ وہ اپنے مشن کو مکمّل کر سکے تو اللہ تعالیٰ کا لطف و کرم دخل انداز ہوتا ہے اور اس بزرگوار کے بچاؤ کے لیے طبیعی قوانین معطل کر دیے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر اس کے کام کی مدّت ختم ہو جائے اور وہ اللہ کی طرف سے تفویض کیا ہوا فریضہ سرانجام دیدے تو پھر زندگی کے طبیعی قوانین کے مطابق یا تو وہ فوت ہو جاتا ہے اور یا شہید ہو جاتا ہے۔

اس سلسلے میں ہمیں اکثر مندرجہ ذیل سوال سے سابقہ پڑتا ہے:

ایک طبیعی قانون کا معطّل کرنا اور مختلف مظاہر میں موجود لازمی تعلّق کو منقطع کرنا کیونکر ممکن ہے؟

کیا اس قسم کی معطّلی سائنس کی تردید کے مترادف نہیں ہوگی جس نے وہ قانون دریافت کیا ہے اور تجربوں اور تحقیق کے ذریعے مظاہر کا باہمی تعلّق متعیّن کیا ہے؟

اس کے جواب میں ہمیں یہ کہنا ہے کہ خود سائنس نے یہ دعویٰ ترک کر دیا ہے کہ طبیعی قوانین 'ضروری' ہیں اور یوں اس نے مندرجہ بالا سوال کا جواب خود مہیّا کر دیا ہے۔ سائنس آزمائش اور مشاہدے کی بنیاد پر طبیعی قوانین کے چہرے پر سے پردہ اٹھاتی ہے اور دو مظاہر کے مابین تعلّق کے بارے میں گوناگوں تجربے کرنے کے بعد اس تعلّق کے ایک طبیعی قانون ہونے کا اعلان کرتی ہے اور کہتی ہے کہ: جب پہلا مظہر رونما ہوتا ہے تو اس کے فوراً بعد دوسرا مظہر دکھائی دیتا ہے لیکن ایک طبیعی قانون بیان کرتے وقت وہ یہ دعویٰ ہرگز نہیں کرتی کہ ان دو مظاہر کے درمیان ایک جبری اور لازمی تعلّق موجود ہے جو ان کی تہہ اور ذات سے پیدا ہوا ہو کیونکہ 'جبر' ایک ایسی حالت ہے جسے استقرائی اور سائنسی تجربوں اور مطالعے کے ذریعے قطعی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لہٰذا جدید سائنس اس بات پر زور دیتی ہے کہ جس انداز سے وہ ایک طبیعی قانون کی تعریف کرتی ہے وہ ایک جبری تعلّق پر دلالت نہیں کرتا بلکہ اس سے مراد دو مظاہر کے درمیان ایک غیر متغیّر اور مسلسل رابطہ ہے۔

پس اگر معجزہ رونما ہو اور دو مظاہر کا طبیعی تعلّق ٹوٹ جائے

تو اِس تعلّق کا ٹوٹ جانا جبری نہیں ہے۔

درحقیقت جدید سائنس کی روشنی معجزے کے لفظ کے مفہوم کو دینی لحاظ سے بہت زیادہ وسعت حاصل ہوگئی ہے اور "اصحابِ مدرسہ" (SCHOLASTICS) نے علّت اور معلول کے تعلّق سے جو کچھ دریافت کیا تھا اس کے مقابلے میں اس کے معانی کہیں زیادہ وسیع ہو گئے ہیں۔

قدیم نظریے کے مطابق اگر دو مظاہر ہمیشہ یکے بعد دیگرے ظہور پذیر ہوں تو ان کے مابین تعلّق ناگزیر ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے سے جدا ہو ہی نہیں سکتے لیکن جدید سائنسی نظریے کے مطابق اس ناگزیر تعلّق کی جگہ "اتّصال یا غیر متغیّر تسلسل" کے قانون نے لے لی ہے اور یوں شیدہ اور قطعی جبر کو لازم قرار نہیں دیا جاتا۔ لہٰذا معجزے کو اس غیر متغیّر تسلسل کی ایک استثنائی حالت سمجھا جاتا ہے اور یہ منطقی لزوم سے بھی متصادم نہیں ہوتا تاکہ ناممکن نظر آئے۔

جب ہم جدید سائنس کے نقطۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں اور استقراء (INDUCTION) کی منطقی بنیادوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ "استقرار دو مظاہر کے درمیان یقینی تعلّق کی

دلیل نہیں ہے"، بلکہ ان کے درمیان مسلسل رابطے کی دلیل ہے اور یہ ایک ایسا رابطہ ہے جو خدائے تعالیٰ کی حکمت کی بنیاد پر اِن دو مظاہر کے درمیان وجود میں آیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں خدا نے اپنی حکمت کے مطابق یہ چاہا ہے کہ بعض مظاہر کے مابین مسلسل تعلّق قائم ہو اور یہی حکمت بعض اوقات اس رابطے کو توڑ دیتی ہے اور خدائے بزرگ ایک طبیعی قانون بنانے والے رابطوں کو توڑ کر ایک استثنائی صورت پیدا کرتا ہے اور ایک معجزہ دکھاتا ہے۔

فلسفۂ طولِ عمر

اب ہمیں اس مسئلے پر غور کرنا ہے کہ آخر اللہ تعالیٰ امام مہدیؑ کی عمر کو کیوں طول دینا چاہتا ہے اور ان کی خاطر طبیعی قوانین کا معطل کرنا کیوں ضروری ہے۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ معیّنہ دن کی پیشوائی ایسے شخص کے سپرد کی جائے جو مستقبل میں پیدا ہو اور اس کی پرورش اور تربیّت اس کی پیدائش کے وقت کی ضروریات کے مطابق کی جائے؟ دوسرے الفاظ میں امامؑ کی اس طویل غیبت کا کیا جواز ہے؟

امام مہدیؑ کی غیبت اور طویل عمر کے بارے میں بہت سے لوگ سوال کرتے ہیں۔ اگر انھیں ایمان بالغیب کی بنیاد پر جواب دیا جائے تو وہ ان کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوتا اور وہ چاہتے ہیں کہ انھیں عام فہم اور معاشرے پر حاکم اقدار کی بنیاد پر جواب دیا جائے تاکہ وہ غیبت کے فلسفے کی پیچیدگیوں میں سے مہدیؑ کے انقلاب[1] اور معیّنہ دن کی حقیقت کو سمجھ سکیں لہٰذا ضروری ہے کہ ہم فی الحال اس مسئلے پر اپنے عقیدے سے صرفِ نظر کرتے ہوئے مندرجہ ذیل جواب دیں۔

نامزد شدہ رہنما کی غیبت اور لمبی عمر دو ایسے محرّکات ہیں جن کی بدولت وہ اُس انقلاب کو جس کے ہم انتظار میں ہیں بہتر طور پر برپا کر کے اپنا کردار اور رہنمائی کا فریضہ ادا کر سکتے ہیں۔

ہماری جانب سے اس سوال کا جواب اثبات میں ہے۔ اس جواب کے بارے میں کچھ دلائل حسب ذیل ہیں۔

مہدی کی زندگی کی سائنسی بنیاد

مجوّزہ عظیم انقلاب اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ اس کا قائد

[1] قیام و انقلابِ مہدیؑ کے عنوان پر ہماری کتاب "آخری فتح" ملاحظہ فرمائیے۔

بے نظیر ذہنی صلاحیتوں کا مالک ہو۔ اسے اپنے مکتب کی برتری کا پورا پورا احساس ہونا چاہیئے اور اس بات کا علم بھی ہونا چاہیئے کہ اُسے جس پیچیدہ نظام کو تہ و بالا کرنا ہے وہ ایک حقیر اور ادنیٰ چیز ہے۔ جس فاسد معاشرے کے خلاف اسے جنگ لڑنا ہے اُس کے حقیر اور ناچیز ہونے کا جتنا زیادہ اسے احساس ہوگا اتنا ہی زیادہ وہ ذہنی طور پر اس کے خلاف فتح حاصل ہونے تک لڑتے رہنے پر آمادہ ہوگا۔

ظاہر ہے کہ قائد کی ذہنی صلاحیتیں مجوّزہ انقلاب اور مٹائے جانے والے معاشرتی نظام کے قد و قامت سے متناسب ہونی چاہئیں۔ یہ نظام جتنا وسیع ہوگا اور اس کی جڑیں جتنی گہری ہوں گی اس کے خلاف اتنی ہی زبردست نفسیاتی یورش کی ضرورت ہوگی۔

چونکہ جو کام انجام دیا جانا ہے وہ ظلم اور زیادتی سے بھرپور دنیا میں انقلاب برپا کرنا اور اس کی تہذیبی اقدار اور مختلف نظام ہائے زندگی میں بنیادی تبدیلیاں لانا ہے لہٰذا قدرتی طور پر اُسے ایک ایسے شخص کے سپرد کرنا چاہیئے جس کی ذہنی صلاحیت تمام تر موجود دنیا کے ہر شخص سے برتر ہو اور جس کی پیدائش اور تربیت

ایک ایسے معاشرے میں نہ ہوئی ہو جسے ملیامیٹ کر کے اس کی بجائے عدل و صداقت پر مبنی ایک نیا معاشرہ تعمیر کرنا مقصود ہو۔ جس شخص نے ایک مستحکم اور دنیا پر مسلّط تہذیب کے سائے میں پرورش پائی ہو وہ قدرتی طور پر اس تہذیب سے مرعوب اور متاثر ہوتا ہے کیونکہ اس نے فقط اسی تہذیب کا مشاہدہ کیا ہوتا ہے اور وہ بچپن سے اس کے دماغ پر حاوی ہوتی ہے۔

تاہم جس شخص کا ایک طویل تاریخی پس منظر ہو۔ جس نے کئی ایک عظیم تہذیبوں کا عروج و زوال دیکھا ہو جس نے کتابوں میں پڑھنے کی بجائے بڑی بڑی تاریخی تبدیلیوں کا خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہو اور جو معیّنہ دن سے پیشتر موجود آخری تہذیب کا ہم عصر رہا ہو اور اس کے تمام نشیب و فراز دیکھ چکا ہو اس کا معاملہ یکسر مختلف ہونا چاہیئے۔

ایک شخص جس نے ان تمام مرحلوں کے دوران اپنی زندگی احتیاط اور توجّہ سے گزاری ہو اس قابل ہوتا ہے کہ جس تہذیب کے خلاف اسے نبرد آزما ہونا ہے اسے اس کے تاریخی پس منظر میں دیکھے اور اس کے کرّ و فر سے مرعوب نہ ہو۔ وہ اسے ایک ناقابل تغیّر تقدیر نہیں سمجھتا۔ اس تہذیب کے بارے میں اس کا

رویّہ ایسا نہیں ہوسکتا جیسا کہ روسو کا فرانس کی بادشاہت کے بارے میں تھا۔

روسو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ گو ذہنی اور فلسفیانہ نقطۂ نگاہ کے مطابق وہ سیاسی انقلابات کا بہت بڑا مؤیّد تھا تاہم وہ فرانس، بغیر بادشاہ کے، تصوّر سے ہی کانپ جاتا تھا۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بادشاہت کے دوران ہی پیدا ہوکر بڑا ہوا تھا اور اس نے اپنی ساری زندگی بادشاہت کے زیرِ سایہ ہی گزاری تھی۔ تاہم جس شخص کا طویل تاریخی پس منظر ہو اور وہ تمام تاریخی عوامل سے واقف ہو بخوبی جانتا ہے کہ رائج الوقت تہذیب اور نظام کب اور کیسے وجود میں آئے اور پروان چڑھے وہ یہ بھی جانتا ہے کہ تہذیبیں اور نظام خواہ کتنے ہی پرانے کیوں نہ ہوں ان کی تاریخی عمر بے حد محدود ہوتی ہے۔

کیا آپ نے قرآنِ مجید کا اٹھارواں سورہ (سورۃ الکہف) پڑھا ہے جس میں ان صالح نوجوانوں کا قصّہ درج ہے جو اللہ پر ایمان رکھتے تھے لیکن انھیں ایک ایسے اصنام پرستی کے نظام سے واسطہ پڑا تھا جو اس وقت مسلّط تھا اور توحیدِ الٰہی کا جانی دشمن تھا ؟ اس نظام کی وجہ سے وہ نوجوان بے حد

پریشان ہوئے اور مایوسی کا شکار ہو گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کریں اور کیا نہ کریں اور اسی مایوسی کے عالم میں انھوں نے ایک غار میں پناہ لی۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ ظالمانہ نظام ہمیشہ قائم رہے گا اور حق کے پرستاروں کا خاتمہ کر دے گا۔

کیا آپ جانتے ہیں کہ اللہ نے کیا کیا؟ اُس نے انھیں ۳۰۹ سال تک اس غار میں محوِ خواب رکھّا۔ پھر وہ اس کی مرضی کے مطابق جاگ اُٹھے اور جیتی جاگتی دنیا میں لوٹ گئے اُس وقت تک وہ ظالمانہ نظام جس کی شان و شوکت ان کی نگاہوں کو خیرہ کرتی تھی مٹ کر گزشتہ دور کی تاریخ کا جزو بن چکا تھا۔ یہ اہتمام اس لیے کیا گیا تاکہ جس باطل کے دبدبے اور ہیبت نے ان نوجوانوں کو مرعوب کر رکھّا تھا اس کا سقوط وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ اس انوکھے تجربے کی بدولت اصحابِ کہف کو ایسی اخلاقی ترقّی اور بلندی نصیب ہوئی جس نے ان کی عمریں سینکڑوں سال تک بڑھا دیں۔ اپنی طویل عمر کی بدولت پیشوائے منتظر کو بھی یہی فائدہ حاصل ہوگا۔ وہ دیکھ سکیں گے کہ کس طرح ایک دیو ایک بونے میں، ایک بلند درخت ایک

ننھّے پودے میں اور ایک طوفان ہوا کے ایک جھونکے میں تبدیل ہوگیا ہے۔

علاوہ ازیں انقلاب کی قیادت کے لیے نامزد شدہ شخص کو بہت سی سلسلہ وار تہذیبوں کے براہِ راست اور گہرے مطالعہ سے جو تجربہ حاصل ہوگا وہ اس کے ذہنی افق کو وسیع کرے گا اور اُسے اپنا مشن پایۂ تکمیل کو پہنچانے کے لیے بہتر طور پر تیّار کرے گا۔ وہ دوسروں کے مضبوط اور کمزور پہلوؤں کو جانتے ہوئے ان کے تجربات سے استفادہ کرے گا اور تاریخی سیاق وسباق میں معاشرتی پیش رفت کا صحیح اندازہ لگانا اس کے لیے زیادہ بہتر طور پر ممکن ہوگا۔

چونکہ پیشوائے منتظر کو جو انقلاب برپا کرنا ہے وہ نظریاتی ہوگا اور اس کی بنیاد اسلام کے پیغام پر ہوگی اس لیے اس کے مشن کی ماہیّت اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ وہ ابتدائی اسلامی مآخذ سے قریب ہو اور اس کی شخصیت بنانے میں اس تہذیب کا کوئی دخل نہ ہو۔ جس کے خلاف اسے برسرِپیکار ہونا ہے۔ اس امر کا وسیع امکان ہے کہ جس شخص کی ولادت اور پرورش ایک مخصوص تہذیب

کے سائے تلے ہوئی ہو وہ اس تہذیب کے اثرات سے مکمّل طور پر الگ تھلگ نہیں رہ سکتا خواہ وہ اس کے خلاف مہم کی قیادت ہی کیوں نہ کرے۔ اِس امر کو یقینی بنانے کے لیے کہ نامزد شدہ پیشوا نے جس تہذیب کو بدلنا ہے وہ خود اس سے متاثّر نہیں ہے اس کی مکمّل تعمیر تہذیب کے اس مرحلے پر ہونی چاہیئے جس کی عام روح اُس نظام سے قریب تر ہو جسے وہ قائم کرنا چاہتا ہو۔

امام مہدیؑ کی اپنے مِشن کے لیے تربیّت

اب ہم تیسرے سوال کو لیتے ہیں یعنی امام مہدیؑ کو بحیثیّت پیشوا مکمّل تربیّت کیونکر حاصل ہوئی جب کہ انھوں نے اپنے والدِ بزرگوار کے ساتھ کل پانچ سال گزارے اور یہ عمر ایک رہنما کی شخصیّت پختہ ہونے کے لیے مناسب نہیں ہے۔

مندرجہ بالا سوال کا جواب یہ ہے :

امام مہدیؑ اپنے والد کی وفات پر بلا فاصلہ مسلمانوں کی پیشوائی کے منصب پر فائز ہوئے یعنی نوعمری کے عالم

میں امام بنے اور وہ اس وقت امامت کے لیے روحانی لحاظ سے مکمّل طور پر تیّار تھے۔

نوعمری میں امامت پر فائز ہونا ایک ایسا مظہر قدرت ہے جو امام مہدیؑ کے اجداد میں سے بھی دو بزرگواروں کے حصّے میں آیا ہے یعنی امام محمد بن علی الجواد علیہ السّلام اور اُن کے فرزند امام علی بن محمد الہادی علیہ السّلام جو دونوں آٹھ آٹھ سال کی عمر میں منصبِ امامت پر فائز ہوئے۔ تاہم نوعمری میں امامت کا مظہر امام مہدیؑ کے زمانے میں عروج پر پہنچ گیا۔ ہم امامت کو مظہرِ قدرت مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر کہتے ہیں:

ا۔ ائمّہ اہلبیتؑ میں سے کسی امام کی امامت موروثی طاقت اور رسوخ کا مرکز نہیں تھی اور نہ ہی فاطمی خلفاء کی امامت اور عباسی خلفاء کی خلافت کی طرح اسے کسی حکومتی طبقے کی اعانت حاصل تھی ان ائمّہ کو عامۃ النّاس کی جو وسیع حمایت اور اطاعت حاصل تھی اس کی وجہ ان کا دینی اثر و رسوخ اور ان کے پیروؤں کا یہ ایمان تھا کہ فقط وہی

اسلام کی روحانی اور فکری قیادت کے حقدار ہیں۔

ب۔ امامت کی حمایت کی عمومی بنیادیں اسلام کے ابتدائی ایّام سے موجود رہی ہیں۔ امام محمد الباقرؑ اور امام جعفر الصّادقؑ کے زمانے میں انھیں زیادہ وسعت حاصل ہوئی۔ ان کے قائم کردہ مکتب نے ایک وسیع ذہنی تحریک کی شکل اختیار کر لی جس میں سینکڑوں فقیہ، متکلّمین، مفسّرینِ قرآن اور اس زمانے میں مروّج دوسرے اسلامی علوم کے ماہرین شامل تھے۔ جب حسن بن علی وشّاء مسجد کوفہ میں گیا تو وہاں اس نے ایسے نو سو علماء کو دیکھا جو سب کے سب امام جعفر الصّادق علیہ السّلام کی روایت کردہ احادیث نقل کر رہے تھے۔

ج۔ یہ مکتب اور اس کے ماننے والے امامت کا اہل ہونے کے لیے جن شرائط پر ایمان رکھتے تھے وہ بے حد کڑی تھیں[1] اور ایک شخص کے بارے میں انھیں اوصاف کی روشنی میں طے کیا جاتا تھا

---

[1] تفصیل کے لیے ہماری کتاب "نقشِ ائمّہ" ملاحظہ فرمائیے۔

کہ آیا وہ منصبِ امامت کے قابل ہے یا نہیں۔ ان کا ایمان تھا کہ اور باتوں کے علاوہ امام کو اپنے زمانے کا سب سے بڑا عالم ہونا چاہیئے۔

د۔ اس مکتب اور اس کے ماننے والوں کو عقیدۂ امامت کی خاطر عظیم قربانیاں دینی پڑیں کیونکہ ہم عصر حکومتیں اس مکتب کو کم از کم نظریاتی نقطۂ نگاہ سے اپنا حریف تصوّر کرتی تھیں جس کی بنا پر اس کے پیروؤں کو بے حد ظلم و تشدّد کا نشانہ بنایا گیا۔ بہت سے لوگ مارے گئے۔ کئی دوسروں کو قید خانوں میں ڈال دیا گیا۔ جن میں سے سینکڑوں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے کرتے جاں بحق ہو گئے۔ ان بزرگواروں اہلِ بیتِ رسولؐ کی امامت پر ایمان رکھنے کی بڑی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ ان کے لیے اس مکتب میں واحد کشش یہ تھی کہ اس کی بدولت انھیں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کا یقین تھا۔

ھ۔ جن ائمہ اطہارؑ کی امامت کو عامۃ الناس تسلیم کرتے تھے وہ اپنے پیروؤں سے کٹ کر بادشاہوں کی طرح

بلند و بالا محلوں میں نہیں رہتے تھے۔ ان اوقات
کو چھوڑ کر جب حکومتِ وقت نے اُنھیں قید رکھّا۔
جلا وطن کیا یا تنہائی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا ان
پیشواؤں نے کبھی بھی اپنے پیروؤں سے علیٰحدگی اختیار
نہیں کی۔ ہم یہ بات اس بنا پر وثوق سے کہہ سکتے
ہیں کہ بہت سے راویوں نے پہلے گیارہ اماموں میں
سے ہر ایک کے اقوال نقل کیے ہیں اور ان کی طرزِ
زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔ ائمّہ علیہم السّلام مختلف
علاقوں میں تشریف لے جاتے تھے اور انھوں نے
اسلامی دنیا کے مختلف حصّوں میں اپنے نمائندے
مقرّر کر رکھّے تھے اور ان سے باقاعدہ خط وکتابت
کرتے تھے۔ ان کے پیرو بھی جب حج کے ایّام میں مقاماتِ
مقدّسہ کی زیارت کرتے تھے تو مدینہ میں ان کی خدمت
میں ضرور حاضر ہوتے تھے۔ یوں امامِ وقت اور بلادِ
اسلامیہ میں بکھرے ہوئے ان کے پیروؤں میں
مسلسل رابطہ قائم رہتا تھا۔
ائمّہ علیہم السّلام کے ہم عصر خلفاء خود انھیں اور ان

کی روحانی قیادت کو اپنے اور اپنے خاندان کے لیے
ایک عظیم خطرہ تصوّر کرتے تھے۔ اسی بنا پر انھوں
نے اس قیادت کو انتشار سے دوچار کرنے کی ہر
ممکن کوشش کی اور اپنے مذموم مقصد کے حصول
کی خاطر بے حد اوچھے ہتھکنڈے استعمال کیے
ائمہؑ اطہار کے ساتھ ان کا رویّہ اکثر بہت سخت اور
جابرانہ ہوتا تھا۔ ان پر کڑی نظر رکھی جاتی تھی اور
انھیں نظر بند کر دیا جاتا تھا۔ حکامِ وقت کی یہ
نازیبا حرکتیں عام مسلمانوں کے لیے بالعموم اور
ائمہؑ علیہم السّلام کے پیروں کے لیے بالخصوص
تکلیف دہ اور ناگوار ہوتی تھیں۔

یہ چھ نکات تاریخی حقائق پر مشتمل ہیں۔ اگر ہم ان پر
غور کریں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ بعض اماموں کا نوعمری میں
منصبِ امامت پر فائز ہونا کوئی افسانوی چیز نہ تھی بلکہ ایک
زندہ حقیقت تھی۔ یہ ایک یقینی بات ہے کہ ایک شخص جو نوعمری
کے عالم میں مسلمانوں کا امام اور روحانی پیشوا ہونے کا دعویٰ
کرے اور عوام کا ایک عظیم طبقہ اُسے اپنا دینی قائد تسلیم کرے

وہ علمِ دین کے ہر شعبے پر مکمّل عبور رکھتا ہوگا ورنہ لوگ اس کی امامت کا یقین نہیں کریں گے۔

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ مومنین کا ائمّہ اطہارؑ سے مسلسل رابطہ قائم رہتا تھا اور وہ ان کی شخصیّتوں کا اندازہ لگا سکتے تھے۔ لہٰذا یہ امر ناقابلِ قیاس ہے کہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے ایک نوعمر لڑکے کو اس کی حقیقی قدر و قیمت پہچانے بغیر ہی اپنا امام تسلیم کر لیا ہو اور اس کے لیے بڑی سے بڑی قربانیاں دی ہوں۔ اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ لوگوں نے فوری طور پہ اس کے بارے میں کوئی تحقیق اور تفتیش نہیں کی تب بھی ان کے نوعمر امام کے ساتھ مسلسل رابطے کی بنا پر حقیقت سالہا سال تک ڈھکی چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ اگر وہ اپنے علم اور غور و فکر کے معاملے میں بچپنے کا اظہار کرتا تو لازمی طور پہ اس کی قلعی کھُل جاتی۔

اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ امامت کے عام ماننے والے حقیقت کا پتا چلانے سے قاصر رہے تب بھی اگر اس بچّے کی حرکات و سکنات اپنے ہم عمر بچّوں کی طرح بچکانہ ہوتیں تو حکومتِ وقت کے لیے اس کے ڈھول کا پول کھول دینا بڑی

آسان بات تھی۔ یہ بات یقیناً حکومت کے مفاد میں تھی کہ وہ بچّے کو عام لوگوں اور اس کے ماننے والوں کے سامنے لاکر ان پر ثابت کر دے کہ وہ امامت اور ذہنی اور روحانی قیادت سنبھالنے کے قابل نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ ایک چالیس یا پچاس سال کی عمر کے شخص کو امامت کے لیے نااہل ثابت کرنا مشکل ہو لیکن ایک عام بچّے کو خواہ وہ کتنا ہی ذہین کیوں نہ ہوتا نااہل ثابت کرنا چنداں مشکل امر نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے کے حکمرانوں نے جبر و تشدّد کی جو پیچیدہ اور خطرناک پالیسی اختیار کی اس کے مقابلے میں یہ طریق کار زیادہ سادہ اور آسان تھا۔ اگر حکومتِ وقت کے یہ راستہ اختیار نہ کرنے کی کوئی وجہ ہو سکتی ہے تو وہ یہ تھی کہ اسے احساس ہو گیا تھا کہ نوعمری کی امامت محض دکھاوا نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ حکومتِ وقت نے یہ چال بھی چلنی چاہی لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ تاریخ ہمیں اس قسم کی کوششوں اور ان کے ناکامیوں سے دوچار ہونے کے متعلّق بتاتی ہے لیکن یہ نہیں کہتی کہ کسی موقع پر بھی نوعمر امام تذبذب کا شکار ہوا یا اس نے ایسی سراسیمگی کا مظاہرہ کیا جس کی بنا پر اس کی

چھوٹی عمر میں امامت پر لوگوں کا ایمان متزلزل ہو جاتا۔

جب ہم نے کہا تھا کہ نوعمری کی امامت ایک فرضی چیز نہیں بلکہ حقیقت ہے تو اس سے ہماری مراد وہی سب کچھ تھا جو اوپر بیان کیا گیا ہے۔ اس حقیقت کی جڑیں بہت گہری ہیں کیونکہ آسمانی مشن اور الٰہی قیادت کی تاریخ میں اس کی کئی ایک مثالیں ملتی ہیں۔ ہم فقط ایک مثال نقل کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

"اے یحییٰ! کتاب کو مضبوطی سے تھام لو۔ اور ہم نے اسے حکمت عطا کی جب کہ وہ بچّہ ہی تھا۔"

(سورۃ مریم۔ آیت ۱۲)

جب یہ ثابت ہو گیا کہ نوعمری کی امامت ایک ایسی زندہ حقیقت ہے جو پہلے سے اہلبیتِ رسول ؐ کی زندگیوں میں موجود تھی تو پھر امام مہدی ؑ کے اپنے والدِ بزرگوار کی وفات پر چھوٹی عمر میں منصبِ امامت پر فائز ہونے پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔

مسلسل زندگی کی وجوہات

اب ہم چوتھے سوال کی طرف آتے ہیں۔

یعنی اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ خالص علمی لحاظ سے امام مہدیؑ کی زندگی، اس کے تمام مفاہیم یعنی طویل عمر، نوعمری کی امامت اور مکمّل غیبت کے ساتھ ممکن ہے تب بھی یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ وہ واقعی زندہ ہیں کیونکہ محض امکان سے ان کا زندہ ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

چونکہ 'مہدیؑ' کا تصوّر ایک غیر معمولی چیز ہے اس لیے کتابوں میں درج رسولِ اکرمؐ کی چند احادیث یہ ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں کہ مہدیؑ کی ہستی ایک تاریخی حقیقت ہے اور کوئی ایسی فرضی چیز نہیں جو نفسیاتی وجوہ کی بنا پر لوگوں کی ایک کثیر تعداد کے دل و دماغ پر چھا گئی ہو۔

مندرجہ بالا سوال کا جواب:

ایک ایسے پیشوائے منتظر کی حیثیت سے جسے دنیا کی اصلاح کرنا ہو۔ مہدیؑ کے تصوّر کا ذکر رسولِ اکرمؐ کی احادیث میں بالعموم اور ائمہؑ اطہارؑ کے اقوال میں بالخصوص پایا جاتا ہے اس کی اہمیّت اتنی روایات میں بیان کی گئی ہے کہ شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اس موضوع پر برادرانِ اہلِ سنّت کی کتابوں میں ۴۰۰ اور اہلِ سنّت اور اہلِ تشیّع کی کتابوں

میں ملا کر ۶۰۰ روایات ملتی ہیں۔ یہ تعداد اتنی زیادہ ہے کہ بہت سے ایسے مسائل کے بارے میں بھی اتنی روایات نہیں ملتیں جن کے متعلّق مسلمانوں کو عموماً کوئی شبہ نہیں۔

جہاں تک اس تصوّر کے بارھویں امام کی ہستی میں مجسّم ہو جانے کا سوال ہے اس پر اعتقاد رکھنے کا کافی جواز موجود ہے۔ اس جواز کا خلاصہ دو دلائل میں پیش کیا جا سکتا ہے جن میں سے ایک دلیل اسلامی اور دوسری سائنسی ہے۔ اسلامی دلیل سے ہم پیشوائے منتظر کا دنیا میں زندہ موجود ہونا ثابت کریں گے اور سائنسی دلیل سے یہ ثابت کریں گے کہ مہدیؑ محض افسانہ نہیں بلکہ ان کی ہستی ایک ایسی حقیقت ہے جس کا ثبوت تاریخی تجربے سے ملتا ہے۔

جہاں تک اسلامی دلیل کا تعلّق ہے اس کی بنیاد وہ سینکڑوں احادیث ہیں جو رسولِ اکرمؐ اور ائمہ اہلبیتؑ سے ہم تک پہنچی ہیں۔

ان احادیث سے پتا چلتا ہے کہ امام مہدیؑ کا تعلّق رسولِ اکرمؐ کے اہلِ بیت سے ہوگا اور وہ نویں پشت میں حضورؐ کی بیٹی جنابِ فاطمہ زہراؑ کے فرزند امام حسینؑ کی اولاد میں سے

ہوں گے اور بارہ اماموں میں سے بارہویں امام ہوں گے۔

لہٰذا یہ احادیث مہدیؑ کے عام تصوّر کو ایک خصوصی شکل دے دیتی ہیں اور یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ مہدیؑ ائمہؑ اہلبیتؑ میں سے بارہویں امام کے علاوہ اور کوئی شخص نہیں ہیں۔ اگرچہ ائمہؑ اطہارؑ اس خوف سے کہ کہیں امام مہدیؑ کی ذات پر حملہ نہ ہو اس موضوع پر کچھ کہتے ہوئے بہت احتیاط برتتے تھے لیکن اس کے باوجود متعلّقہ احادیث کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

ہم ان احادیث کو ان کی تعداد کی بنا پر ہی قبول نہیں کرتے بلکہ اُن کے معتبر ہونے کے اور دلائل بھی ہیں۔ آنحضرتؐ کی ایک حدیث کے مطابق جو مختلف طریقوں سے نقل کی گئی ہے بارہ خلفاء بارہ امام یا بارہ سردار آپ کے جانشین ہوں گے۔ بعض مصنّفین نے حساب لگایا ہے کہ یہ حدیث ۲۷۰ سے زیادہ طریقوں سے نقل کی گئی ہے اور اہلِ تشیّع اور اہلِ سنّت کی کئی ایک معروف کتابوں مثلاً صحیح بخاری، صحیح مسلم، صحیح ترمذی، سنن ابوداؤد، مُسند احمد بن حنبل اور مستدرکِ حاکم میں موجود ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ صاحبِ بخاری جنھوں نے یہ حدیث نقل کی ہے۔ امام محمد تقی الجوادؑ، امام علی نقی الہادیؑ اور امام حسن العسکریؑ

کے ہم عصر تھے۔ یہ بات بڑی اہم ہے کیونکہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس حدیث کے حقیقت کا جامہ پہننے سے پہلے اسے ضبطِ تحریر میں لایا گیا لہٰذا یہ شک نہیں کیا جا سکتا کہ یہ اہلِ تشیّع کے اعتقاد کے مطابق ائمہؑ کی صحیح تعداد پر ممکنہ اظہارِ خیال ہے تاکہ ان کے بارہ اماموں پر عقیدے کو تقویت پہنچائی جا سکے۔ یہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ رسولِ اکرمؐ سے منسوب کی گئی بعض جعلی احادیث میں ایسے واقعات کا ذکر کیا گیا ہے جو پہلے رونما ہوئے ہیں اور حدیث بعد میں نقل کی گئی ہے۔ ایسی حدیثوں کا واقعات سے پہلے نہ تو کوئی وجود ہے، اور نہ ہی انھیں اس سے پہلے حدیث کی کتابوں میں نقل کیا گیا ہے۔

جب تک ہمارے پاس اس امر کا واضح ثبوت موجود ہو کہ ایک حدیث، ائمہؑ علیہم السّلام کی تعداد فی الواقع مکمّل ہونے سے پہلے ضبطِ تحریر میں لائی گئی ہے ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک طے شدہ امر پر اظہارِ خیال نہیں ہے۔ اس کے برعکس یہ اس صادقُ القول رسولؐ کا کلمۂ حق ہے جس نے اپنی مرضی سے کبھی کچھ نہیں کہا اور جس کی پیش گوئی اس وقت پوری ہوئی جب امام علیؑ سے شروع ہو کر امام مہدیؑ تک ائمہؑ اطہار کی تعداد بارہ ہو گئی۔

جہاں تک سائنسی دلیل کا تعلّق ہے ہمیں یہ کہنا ہے کہ یہ دلیل لوگوں کی ایک بڑی تعداد کے تجربے پر مبنی ہے جو انھیں ستّر سال کی مدّت میں حاصل ہوا۔ یہ مدّت غیبتِ صغریٰ کہلاتی ہے اِس نکتے کی وضاحت کے لیے ہم مختصر طور پر غیبتِ صغریٰ کا ذکر کریں گے۔

غیبتِ صغریٰ

یہ پیشوائے منتظر کی امامت کا پہلا دَور ہے۔ آپ کو اپنی امامت کی ابتدا ہی سے جسمانی طور پر لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہونا پڑا حالانکہ وہ اب بھی جو کچھ ان کے اردگرد ہوتا ہے اس میں گہری دلچسپی لیتے ہیں۔ اگر یہ غیبت اچانک وقوع پذیر ہوتی تو آپ کے پیروؤں کو بے حد صدمہ ہوتا کیونکہ وہ امام (یعنی آپ کے پیشرو ائمّہ) سے رابطہ قائم کرنے اور ان سے اپنے مسائل کا حل دریافت کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔ ان کے یکایک غائب ہو جانے سے ایک بہت بڑا خلا پیدا ہو جاتا اور ممکن تھا کہ اسلام کا وجود ہی خطرے میں پڑ جاتا کیونکہ آپ کے پیروؤں کو یہ احساس ہوتا کہ ذہنی اور روحانی قیادت

سے ان کا رابطہ منقطع ہوگیا ہے۔ ان لوگوں کو غَیبت کے تصوّر سے آشنا کرنے اور انھیں نئی صورتِ حال سے مطابقت پیدا کرنے کے لیے آمادہ کرنے کی خاطر یہ ضروری خیال کیا گیا کہ قطعی غَیبت ایک ابتدائی مرحلے کے بعد وقوع پذیر ہو۔

یہ مرحلہ غَیبتِ صغریٰ کا تھا جس کے دوران امام علیہ السلام عوام النّاس کی نگاہوں سے تو اوجھل ہوگئے لیکن انھوں نے چند نائبین کے توسّط سے اپنے پیروؤں کے ساتھ رابطہ برقرار رکھّا۔ اس زمانے میں چار اشخاص جن کی پرہیزگاری اور پاکبازی مسلّمہ تھی امام علیہ السّلام کے نائبین کے فرائض انجام دیتے رہے۔

(۱) —— عثمان بن سعید العمروی

(۲) —— محمد بن عثمان بن سعید العمروی

(۳) —— ابوالقاسم حسین بن روح

(۴) —— ابوالحسن علی بن محمد السیمری

یہ چار اشخاص مندرجہ بالا ترتیب سے امام علیہ السلام کے نائب کے فرائض انجام دیتے رہے۔ جب ان میں سے ایک کا انتقال ہوجاتا تو آپ اس کی بجائے دوسرے کو نامزد کر دیتے آپ کا نائب اہلِ تشیّع سے اپنا رابطہ قائم رکھتا تھا۔ وہ اُن کے

سوالات اور مسائل امامؑ کے سامنے پیش کرتا اور امامؑ کی جانب سے دیے گئے جوابات اُنھیں پہنچاتا تھا۔ جوابات زیادہ تر تحریری اور بعض اوقات زبانی ہوتے تھے۔ چاروں نائبین کے زمانے میں (جو تقریباً ستّر سال جاری رہا) امام کی طرف سے جو خطوط موصول ہوئے ان کی تحریر کا انداز اور اسلوب یکساں تھا اور ان پر دستخط بھی ایک جیسے ہوا کرتے تھے۔

آخری نائب السیمری تھے۔ انھوں نے غیبتِ صُغریٰ کے خاتمے کا اعلان کیا (جس کی خصوصیّت نائبین کا تقرّر تھا) جب اہلِ تشیّع امام کی غیبت سے مانوس ہو گئے اور غیبتِ صغریٰ کا مقصد حاصل ہو گیا تو یہ غیبتِ کبریٰ میں تبدیل ہو گئی۔ غیبتِ صغریٰ کے ذریعے اُنھیں صدمے اور خلا سے محفوظ کر دیا گیا تھا۔

غیبتِ کبریٰ کے شروع ہونے کے بعد امام علیہ السّلام کی نمائندگی خاص طور پر مقرّر کیے گئے نائبین کی بجائے عام طور پر جامع الشرائط مجتہدین کرتے ہیں جنھیں روحانی اور دنیاوی معاملات پر مکمل عبور حاصل ہوتا ہے۔

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ امام مہدیؑ کی زندہ ہستی ایک ایسی حقیقت ہے جس کا تجربہ بہت سے

لوگوں کو ہوا ہے ۔ ستّر سال تک ان کی نمائندگی اُن کے خصوصی نائبین نے کی ۔ لوگوں کی ایک کثیر تعداد نے ان سے رابطہ قائم رکھّا لیکن کسی کو بھی اُن کے قول میں کوئی تضاد یا فعل میں کسی دھوکے یا فریب کا کوئی نشان نظر نہیں آیا ۔ کیا اس بات کا تصوّر کیا جا سکتا ہے کہ چار اشخاص نے یکے بعد دیگرے ستّر سال تک لوگوں کو فریب میں مبتلا رکھّا لیکن کسی کو اس بارے میں کوئی شک نہ گزرا ؟ ان چار اشخاص کا آپس میں کوئی خاص رابطہ نہیں تھا اور ان کے باہمی گٹھ جوڑ کا کوئی گمان نہیں کیا جا سکتا ۔ ان کا کردار بے داغ تھا ۔ سبھی ان پر اعتماد کرتے تھے اور ان کے دعوے کی صحّت اور تجربے کی حقیقت پر یقین رکھتے تھے ۔

ایک کہاوت کے مطابق سچ ہمیشہ ظاہر ہو کر رہتا ہے ۔ عملی زندگی کے واقعات بھی ثابت کرتے ہیں کہ مکر و فریب کا جادو اس انداز میں اتنی طویل مدّت کے لیے نہیں چل سکتا ۔ یہ ممکن نہیں کہ ایک شخص لوگوں کو مسلسل دھوکا دیتا رہے اور پھر اسے ان کا اعتماد بھی حاصل ہو ۔

پس پتا چلتا ہے کہ غیبتِ صغریٰ پیشوائے منتظر کے بارے میں حقائق ثابت کرنے کے لیے ایک سائنسی تجربے کے مترادف

ہے۔ ان حقائق میں آپ کی ولادت، زندگی اور غیبت کے علاوہ آپ کی غیبتِ کبریٰ کا اعلان شامل ہے جس کے مطابق آپ نے دنیا کی ظاہری زندگی سے علیٰحدگی اختیار کر رکھی ہے اور اپنا تعارف کسی سے نہیں کراتے۔

غیبت کے اسباب

حب امام مہدیؑ نے اپنے آپ کو اپنے مشن کے لیے تیار کر رکھا تھا تو پھر آپ اتنے طویل عرصے تک ظاہر کیوں نہیں ہوئے؟ آپ کے غیبتِ صغریٰ کے دوران یا اس کے خاتمے پر ظاہر ہونے میں کیا امر مانع تھا کہ آپ نے اسے غیبتِ کبریٰ میں تبدیل کر دیا؟ اس وقت ضروری تبدیلی لانا نسبتاً زیادہ سہل تھا اس وقت ان کے لیے اپنی قوت کو مجتمع کر کے حرکت میں لانے اور اپنا کام زور و شور سے شروع کرنے کا سنہری موقع تھا کیونکہ غیبتِ صغریٰ کے دوران جو نظام قائم تھا اس کی بدولت آپ کا لوگوں سے رابطہ برقرار تھا۔ اس کے علاوہ اس زمانے میں حکمران طبقے اتنے طاقتور نہیں تھے جتنے وہ بعد میں سائنسی اور صنعتی ترقی کے ذریعے ہو گئے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ:

ایک انقلابی تحریک کی کامیابی کا انحصار چند خارجی شرائط اور ایک مخصوص ماحول کی موجودگی پر ہوتا ہے۔ جب تک وہ شرائط پوری نہ ہوں اور وہ ماحول وجود میں نہ آئے وہ تحریک اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکتی۔

اگرچہ امام مہدیؑ کے انقلاب کی کچھ شرائط خدائے تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ ہیں اور ان کی نوعیت آسمانی ہے لیکن ان کے مشن پر مکمل عملدرآمد کا انحصار چند ناگزیر خارجی شرائط اور حالات کی موجودگی پر ہے۔

یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ طلوعِ اسلام سے پہلے پانچ صدیاں خالی گزر گئیں اور رب کہیں اللہ کا آخری پیغام حضرت محمدؐ کی معرفت بنی نوعِ انسان تک پہنچایا گیا حالانکہ ایک مدّت سے دنیا کو اس پیغام کی شدید ضرورت تھی اور وہ اس کے لیے ترس رہی تھی اس پیغام کی آمد میں تاخیر اس لیے ہوئی کہ اس پر کامیاب عملدرآمد کا انحصار چند سازگار حالات پر تھا۔

جو موافق حالات ایک تبدیلی کی تکمیل پر اثرانداز ہوتے ہیں ان میں کچھ تو وہ ہیں جو ایک سازگار ماحول پیدا کرتے ہیں اور

کچھ وہ ہیں جو تحریک کی ابتدا کے لیے صحیح وقت متعیّن کرتے ہیں۔ مثلاً روس میں جس انقلاب کی لینن نے کامیابی سے قیادت کی وہ پہلی عالمی جنگ اور زارشاہی کے زوال اور ایسے ہی کئی ایک اور عوامل سے مربوط تھا۔ علاوہ ازیں کچھ کم درجے کے عوامل بھی سرگرم عمل تھے۔ مثلاً لینن کا وہ تاریخی سفر جس کے نتیجے میں وہ روس میں بحفاظت داخل ہوگیا۔ اگر دوران سفر اسے کوئی حادثہ پیش آجاتا جس کی وجہ سے وہ اس وقت روس میں داخل نہ ہوسکتا تو ممکن تھا کہ انقلاب کی قوت میں کمی آجاتی اور اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوتا۔

یہ بات خدائے تعالیٰ کی ناقابلِ تغیر سنت[1] کے مطابق ہے کہ امام مہدیؑ کا الٰہی انقلاب بھی ایسے خارجی حالات سے وابستہ ہو جو اسے سمجھنے اور قبول کرنے کے لیے موافق ماحول اور عمومی فضا پیدا کرسکیں۔

یہی سنّت اس وقت بھی کارفرما تھی جب سابقہ انبیاء کا دَور گزرنے اور کئی صدیوں کا تلخ خلا پیدا ہونے کے بعد اسلام

---

[1] موضوع "سنّتِ الٰہی ناقابلِ تغیّر ہے" کی تفصیل کے لیے ہماری کتاب تاریخ عاشورا ملاحظہ فرمائیے۔

کا ظہور ہوا۔

بلاشبہ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے۔ وہ معجزاتی طور پر اِن تمام رکاوٹوں کو جن کا ایک آسمانی مشن کی راہ میں حائل ہونے کا امکان ہو پہلے ہی دور کر سکتا ہے لیکن وہ ایسا نہیں کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کو کمال حاصل کرنے کے لیے جن آزمائشوں اور تکلیف دہ حالات سے گزرنا پڑتا ہے وہ اس امر کا تقاضا کرتے ہیں کہ ایک آسمانی انقلاب عام اور فطری طریقوں کے مطابق برپا ہو۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ ایسی جزئیات ترتیب دینے کے لیے مداخلت نہیں کرتا جن کا موافق ماحول پیدا کرنے سے تو کوئی تعلّق نہیں ہوتا لیکن وہ انقلاب کو قوّتِ محرّکہ بخشتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء کے مشن کی حفاظت کی خاطر انھیں نازک حالات میں جو مدد فراہم کی اس کی نوعیت ایسی ہی تھی۔

نمرود کی بھڑکائی ہوئی آگ نے حضرت ابراہیمؑ کو کوئی گزند نہیں پہنچایا۔ جس غدّار یہودی نے حضرت محمدؐ کو قتل کرنے کے لیے تلوار کھینچی تھی اس کا ہاتھ مفلوج ہو گیا۔ غزوۂ خندق کے وقت جن کفّار اور مشرکین نے مدینہ منوّرہ کا محاصرہ کر لیا تھا ان کے خیمے

شدید طوفان کی زد میں آ گئے اور وہ حوصلہ ہار گئے۔ یہ تمام واقعات ایسے ہیں جن میں خدائی امداد ایسے وقت پر پہنچی جب حالات بے حد نازک تھے۔ تاہم یہ سب کچھ اُس وقت ہوا جب مطلوبہ تبدیلی کے لیے سازگار ماحول پہلے ہی قدرتی طور پر پیدا ہو چکا تھا۔

لہٰذا جب ہم امام مہدیؑ کے مقام کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جو انقلابی کام ان کے سپرد کیا گیا ہے وہ معاشرتی تبدیلی کے ہر عمل کی مانند بعض ایسے حالات سے منسلک ہے جو اس کی کامیابی کے لیے موزوں فضا مہیّا کریں گے۔ اس صورت میں یہ قدرتی امر ہے کہ اس کے بروئے کار لانے کا وقت اسی لحاظ سے متعیّن کیا جائے۔ درحقیقت ان کا مشن یہ ہے کہ دنیا کا پورا نظام بدل دیا جائے۔ ان کا کام بنی نوعِ انسان کو گناہ کی تاریکی سے چھٹکارا دلانا اور ایک روشنی اور ہدایت کے دَور کا آغاز کرنا ہے۔

اتنے عظیم انقلاب کے لیے محض ایک قابل قائدؑ کا ہونا کافی نہیں ورنہ یہ کام رسولِ اکرمؐ کے زمانے میں ہی انجام پا چکا ہوتا۔ ایسے انقلاب کے لیے ایک مخصوص فضا اور ایک ایسے عام ماحول کی

ضرورت ہے جو تمام خارجی شرائط مہیّا کرنے میں مُمِد و معاون ثابت ہو۔

انسانی نقطۂ نگاہ سے ایک متمدّن شخص کی مایوسی اور احساسِ محرومی کو صحیح فضا پیدا کرنے کے لیے بنیادی عامل قرار دیا جا سکتا ہے تاکہ وہ امام مہدیؑ کے عادلانہ مشن کو قبول کرے۔ یہ احساس مختلف تمدّنی اور سیاسی تجربات کی ناکامی سے پیدا ہوتا ہے۔ ایسے ہی موقع پر ایک متمدّن شخص مدد کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے غیب کی جانب رجوع کرتا ہے۔ مادّی اعتبار سے امام مہدی کے مشن کی عالمی سطح پر تکمیل کے لیے ان کے ظہور کے زمانے کے حالات کو غیبت کے زمانے کے حالات کے مقابلے میں زیادہ موزوں گردانا جا سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اب فاصلے کم ہو گئے ہیں۔ دنیا کے مختلف حصّوں میں رہنے والے لوگوں کے مابین میل جول کے امکانات بہتر ہو گئے ہیں اور نئے پیغام کی بنیاد پر دنیا کے لوگوں کو روشن خیال بنانے کے لیے ایک مرکزی تنظیم کے قیام کے لیے بہتر وسائل مہیّا ہو گئے ہیں۔

یہ بات اپنی جگہ پر درست ہے کہ جیسا کہ مندرجہ بالا سوال میں کہا گیا ہے۔ جس فوجی قوّت اور جن آلاتِ حرب کا پیشوائے منتظر

کو مقابلہ کرنا پڑے گا ان کی مقدار میں بے تحاشا اضافہ ہوا ہے لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جب انسان اخلاق کے بلند مرتبے پر فائز ہو اور اس نے ظلم اور ناانصافی کے خلاف جنگ کرنے کا پختہ ارادہ کر رکھّا ہو تو مادّی طاقت اس کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔

تاریخ شاہد ہے کہ بہت سی بلند و بالا تہذیبیں حملہ آوروں کے پہلے ہلّے میں ہی زمیں بوس ہو گئیں کیونکہ وہ پہلے سے ہی کھوکھلی ہو چکی تھیں اور ان میں مقابلے کی طاقت نہیں تھی۔

مہدیؑ کا فوق البشر کردار

اب ہم ایک اور سوال زیر بحث لاتے ہیں۔ وہ سوال یہ ہے کہ آیا ایک فردِ واحد، خواہ وہ کتنا ہی عظیم کیوں نہ ہو، اتنا بڑا کام انجام دے سکتا ہے جب کہ سبھی جانتے ہیں کہ ایک عظیم شخص فقط وہی ہوتا ہے جسے حالات صفِ اوّل میں لے آئیں۔

یہ سوال تاریخ کے بارے میں ایک مخصوص نظریے پر مبنی ہے۔ جو تاریخی واقعات کی تشریح اس بنیاد پر کرتا ہے کہ انسان کی حیثیّت محض ثانوی ہے اور تاریخی تبدیلیاں لانے والے اصلی

عوامل وہ قوّتیں جو اس کے اِردگِرد کام کرتی ہیں۔ انسان کو زیادہ سے زیادہ ان قوّتوں کے تعامل کا ایک ذہین شارح کہا جا سکتا ہے۔

یہ امر واضح ہے کہ تاریخ کے دو قطب ہیں۔ ان میں سے ایک انسان ہے اور دوسرا اس کے اِردگِرد موجود مادّی قوّتیں ہیں۔ جس طرح مادّی قوتیں مثلاً پیداوار کی شرائط انسان پر اثر ڈالتی ہیں اسی طرح انسان بھی اپنے اِردگِرد موجود مادّی قوتوں کو متاثر کرتا ہے۔ یہ فرض کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ عمل ہمیشہ ملوّے سے شروع ہوتا ہے اور انسان پر ختم ہوتا ہے۔ صورتِ حال اس کے برعکس بھی ہو سکتی ہے کیونکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان اور مادّہ ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک فرد کے لیے ممکن ہے کہ تاریخ کے دھارے میں جی حضوریے کا کردار ادا نہ کرے بالخصوص جب وہ فردِ بنی نوعِ انسان اور خدائے تعالیٰ کے درمیان رابطے کا کام دیتا ہو کیونکہ وہ تاریخ کی پیشرفت میں ایک عظیم طاقت کی مانند دخل انداز ہوتا ہے اور یہ ایک ایسی چیز ہے جو انبیائے کرام کی رسالت اور بالخصوص خاتم النبیین ؐ کے حالاتِ زندگی سے واضح طور پر ثابت ہوتی ہے کیونکہ حضرت محمدؐ

نے اپنے پروردگار کے احکام کی تعمیل میں تاریخ کی حرکت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں سنبھالی اور ایک ایسے تمدّن کی بنیاد رکھی جس کا ظہور میں لانا آپ کے اردگرد موجود خارجی حالات کے لیے ممکن نہ تھا۔ پس جو چیز سب سے بڑے رسولؐ کے ہاتھوں ہوسکتی ہے اس کا منتظر پیشوا اور آپ ہی کے خاندان کے ایک فرد کے وسیلے سے انجام پانا بھی ممکن ہے یعنی اس پیشوا کے وسیلے سے جس کی آمد کی خبر خود آنحضرتؐ نے دی ہے اور اس کے عظیم انقلابی کردار سے لوگوں کو آگاہ کیا ہے۔

مہدیؑ کے مشن کی تکمیل

اب ہم آخری سوال کو لیتے ہیں یعنی عدل وانصاف کی مکمّل فتح حاصل کرنے اور ظلم وجور کو بیخ وبُن سے اُکھاڑ پھینکنے کی خاطر امام مہدیؑ امکانی طور پر کون سا طریقہ اختیار کریں گے؟

اس سوال کے قطعی جواب کا انحصار فقط یہ جاننے پر نہیں کہ امام مہدیؑ کس وقت اور کس مرحلے پر دوبارہ ظاہر ہوں بلکہ اس ممکنہ تصوّر پر بھی ہے کہ اُس وقت حالات کیا ہوں گے ان حالات کی روشنی میں ہی ان کی امکانی حکمت عملی کی تصویر

کھینچی جاسکتی ہے۔

جب تک ہمیں اس بات کا علم نہ ہو کہ امام مہدیؑ کب ظاہر ہوں گے اور اس وقت حالات کیسے ہوں گے اس وقت تک سائنسی انداز میں کوئی پیش گوئی کرنا ناممکن ہے۔ اس سلسلے میں جو قیاس بھی کیا جائے اس کی بنیاد حقیقت پر نہیں ہوگی بلکہ وہ ایک من گھڑت بات ہوگی۔ تاہم ایک بنیادی احتمال ایسا ہے جسے روایات اور عظیم انقلاب کے تاریخی تجربے کی روشنی میں قبول کیا جاسکتا ہے۔

اس بات کی پیش گوئی بڑے اطمینان سے کی جاسکتی ہے کہ پیشوائے منتظر اُس وقت ظاہر ہوں گے جب ان کے لیے میدانِ عمل مکمّل طور پر آمادہ ہوگا۔ وہ نہ اس سے پیشتر آئیں گے اور نہ بعد میں آئیں گے۔ 'میدانِ عمل' سے ہماری مراد وہ حالات ہیں جن سے انسانی معاشرہ اُس وقت گزر رہا ہوگا۔ اس وقت صورت یہ ہوگی کہ لوگوں کے اخلاق بگڑ چکے ہوں گے۔ ظلم و تشدّد زوروں پر ہوگا اور انسانیت فسق و فجور کی دلدل میں پھنس چکی ہوگی۔

علاوہ ازیں آپ کے ظہور کے لیے میدانِ عمل سے یہ

مراد ہے کہ اُس وقت کے حالات ایک نجات دہندہ کی پذیرائی کے لیے ضروری نفسیاتی فضا تیار کر دیں گے۔ بنی نوعِ انسان صورتِ حالات سے بیزار ہو چکے ہوں اور قدرتی طور پر اپنی رستگاری کے لیے ایک نجات دہندہ کی راہ دیکھ رہے ہوں گے۔ حالات یہ شکل اس وقت اختیار کریں گے جب فسق و فجور اپنی انتہا کو پہنچ جائے گا۔ اس افراتفری کے عالم میں دنیا ایک ایسی آگ کی لپیٹ میں ہو گی جس سے کوئی چیز نہ بچ سکے گی۔ اور یہی وہ وقت ہو گا جب امام مہدیؑ کو یہ فریضہ سونپا جائے گا کہ اس آگ کو بجھائیں اور روئے زمین پر عدل و انصاف پر مبنی آسمانی حکومت قائم کریں۔

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس
خاور کے ثوابت ہوں کہ افرنگ کے سیّار!
پیرانِ کلیسا ہوں کہ شیخانِ حرم ہوں
نے جدّتِ گفتار ہے، نے جدّتِ کردار
ہیں اہلِ سیاست کے وہی کہنہ خم و پیچ
شاعر اسی افلاسِ تخیّل میں گرفتار!
دنیا کو ہے اس مہدیٔ برحق کی ضرورت
ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالمِ افکار!

آخری فتح

فہرس:

بالآخر فتح حق کی ہوگی	۸۹
ظہور کا انتظار ـــــ انتظار کی دو صورتیں	۹۳
معاشرے کا وجود اور اس کی روش	۹۵
قرآن اور تاریخ	۹۷
تاریخ کے ارتقاء کی توجیہہ	۱۰۰
دو مختلف نظریے	۱۰۱
جدلیاتی مادیت کا نظریہ	۱۰۵
اصلی خصوصیت	۱۰۷
قدیم و جدید کا مفہوم	۱۱۲
تاریخ کا منطقی تسلسل	۱۱۳
ہر مرحلے کا نقطۂ عروج	۱۱۴
جنگ کا مقدس ہونا ـــــ تفرقہ پیدا کرنا	۱۱۵
تاریخ ـــــ انسانی نقطۂ نظر سے	۱۱۷
ارتقائی جنگیں	۱۲۳
مسلح جدوجہد کا تقدس ـــــ اصلاحات	۱۲۵
انسان کے بارے میں دو تصور	۱۳۰
مثالی معاشرہ	۱۳۴
عظیم انتظار ـــــ تخریبی انتظار	۱۳۷
نیم جدلیاتی نظریہ ـــــ تعمیری انتظار	۱۳۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بالآخر فتح حق کی ہوگی

یہ تصوّر کہ بالآخر حق وانصاف اور امن وصلح کی قوّتوں کو باطل اور ظلم وزیادتی کی قوّتوں پر فتح حاصل ہوگی اور اسلام دنیا کے طول وعرض میں پھیل جائے گا، اعلیٰ انسانی قدریں اپنائی جائیں گی، ایک مثالی اور معیاری معاشرہ وجود میں آئے گا اور یہ سارا کام ایک مقدس ہستی کے ہاتھوں انجام پائے گا جسے اسلامی روایات میں "مہدی" کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ ایک ایسا تصوّر ہے جسے ـــــ تفصیلات میں معمولی اختلاف کے ساتھ ـــــ تمام اسلامی فرقے اور مکاتب تسلیم کرتے ہیں۔[1]

---

[1] اسلام میں "مہدی" پر اعتقاد کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ بعض علماء نے اس عقیدے کو دین کے واجبات میں شمار کیا ہے۔ مہدی کی خصوصیات اور شخصیت کے بارے میں اختلاف ہوسکتا ہے لیکن سبھی اس بات پر متفق ہیں کہ ان کے متعلق زیادہ تر روایات (باقی صفحہ ۹۰ پر دیکھیے)

دراصل یہ ایک قرآنی تصوّر ہے۔ قرآن مجید واشگاف الفاظ میں

(صفحہ ۸۹ سے آگے) صحیح ہیں اور جو خوشخبری ان کے بارے میں دی گئی ہے وہ متواتر ہے۔

اس سلسلے میں یہ امر دلچسپی کا باعث ہے کہ جیسا کہ مشہور مؤرخ طبری نے لکھا ہے، مہدی کی غیبت سے متعلق روایات شیعہ محدثین نے امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کی زندگی ہی میں (ولادت مہدی سے ۱۵۰ سال پہلے) اپنی کتابوں میں درج کر دی تھیں۔ یہ امر بجائے خود ان روایات کی صحت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں کئی مقامات پر مہدی کے بارے میں روایات بلاواسطہ نقل کی گئی ہیں اور اسی قبیل کی تقریباً پچاس احادیث دوسری معروف تالیفات میں بھی درج ہیں جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں:

ابو داؤد۔ ترمذی۔ مسند احمد بن حنبل۔ ابن ماجہ۔ طبرانی (تینوں مجموعوں میں جن کے نام الکبیر، الاوسط اور الصغیر ہیں) الحاکم (مستدرک)۔ ابو یعلیٰ۔ البزار۔ ابن حبان ابو الشیخ (کتاب الفتن)۔ ابن عساکر۔ ابن عدی۔ ابو نعیم (اخبار المہدی)۔ الرویانی (مسند)۔ الدیلمی۔ الدانی (سنن)۔ ابن مندہ۔ نعیم ابن حماد (کتاب الفتن)۔ الحارث ابن علی اسامہ، (مسند)۔ الخطیب البغدادی (تاریخ)۔ ابن علی شیبہ (مصنف)۔ الدارقطنی۔ ابو نعیم (دلائل النبوۃ اور الحلیہ)۔ ابن المنادی (الملاحم)۔ ابو غنام الکوفی (کتاب الفتن)۔ ابن سعد (طبقات)۔ ابن جریر (تفسیر) اور المحاملی (الامالی)۔

ان معتبر مآخذ میں رسولِ اکرمؐ سے تقریباً پچاس ایسی احادیث نقل کی گئی ہیں جن میں یوم قیامت سے پیشتر مہدی کے ظہور کے بارے میں واضح پیشین گوئی کی گئی ہے۔ ان میں سے بیشتر احادیث صحیح ہیں اور ۳۳ معروف صحابیوں اور صحابیات نے آنحضرتؐ سے بلاواسطہ نقل کی ہیں جن میں علی ابن ابی طالب۔ حسین ابن علی۔ ابو سعید الخدری (باقی صفحہ ۹۱ پر دیکھیے)

یہ خوش خبری دیتا ہے کہ حق و باطل کی جنگ میں "آخری فتح" اسلام کی

(صفحہ ۹۰ سے آگے) عبداللہ ابن مسعود۔ ام سلمٰی۔ ثوبان۔ ابوہریرہ۔ انس ابن مالک۔ جبیر ابن عبداللہ۔ عثمان ابن عفان۔ عوف ابن مالک۔ طلحہ ابن عبیداللہ۔ حذیفہ ابن الیمان۔ عمران ابن حصین۔ عبداللہ ابن عمر۔ عائشہ۔ عبدالرحمٰن ابن عوف۔ ابوایوب الانصاری۔ ابن عباس۔ تمیم الداری۔ ام حبیبہ۔ عباس ابن عبدالمطلب اور عمار ابن یاسر شامل ہیں۔ ان احادیث میں سے معروف ترین حدیث وہ ہے جو عبداللہ ابن مسعود نے نقل کی ہے اور جس کے مطابق رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ:

"اگر دنیا کی زندگی میں سے فقط ایک دن بھی باقی ہوگا تو اللہ اس دن کو طویل کر دے گا تاکہ میرے اہل بیت میں سے ایک ایسے شخص کو بھیجے جس کا نام میرا نام اور جس کی کنیت میری کنیت ہوگی۔ وہ دنیا کو اسی طرح عدل و انصاف سے معمور کر دیگا جیسے وہ اس سے پہلے ظلم اور نا انصافی سے پُر ہوگی۔" (ابوداؤد۔ طبرانی۔ ابن حبان۔ حاکم۔ ابن ماجہ ابونعیم۔ ابن عساکر وغیرہ)۔

یہ اور بہت سی دوسری احادیث صحت کے اس اعلیٰ معیار پر پوری اترتی ہیں جو محدثین نے قائم کیا ہے۔ لہٰذا تمام اسلامی علماء نے تمام ادوار میں اس امر پر اتفاق کیا ہے کہ یہ حدیث صحیح اور متواتر ہے۔ متقدمین سے متأخرین تک جن محدثین اور مؤرخین نے اپنی کتابوں میں مہدی کا تذکرہ کیا ہے ان میں احمد بن حنبل، مسند۔ محمد بن اسماعیل بخاری، صحیح۔ مسلم بن حجاج نیشاپوری، صحیح۔ ابوداؤد، سنن۔ ابن ماجہ سنن۔ محمد بن عیسیٰ ترمذی، صحیح۔ محمد باقر مجلسی، بحارالانوار۔ شیخ سلیمان قندوزی، ینابیع المودۃ۔ ابن حجر عسقلانی، صواعق محرقہ۔ محی الدین ابن عربی، فتوحات مکیہ۔ جلال الدین سیوطی، علامات المہدی۔ ملا علی متقی، البرہان فی علامات المہدی آخرالزمان۔ ابن تیمیہ، منہاج السنت النبویہ۔ (باقی صفحہ ۹۲ پر دیکھیے)

ہوگی[1] دنیا میں متقی اور صالح افراد غالب آئیں گے[2] اور ظالم ہمیشہ کے لیے بے دست وپا ہو جائیں گے[3] مختصراً قرآن مجید عالمِ انسانیت کے لیے ایک روشن اور خوش آئند مستقبل کی خبر دیتا ہے۔[4]

یہ عقیدہ کسی خوش فہمی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ نظامِ قدرت، تاریخ کے ارتقائی عمل اور مستقبل پر اعتماد کے بارے میں اس کا نشان ملتا ہے اگرچہ غیر اسلامی نظریات کے مطابق انسان کا مستقبل تابناک نہیں بلکہ تاریک ہے۔

(از صفحہ ۹۱) قرطبی، التاریخ، عبداللہ بن محمد صدیق، المہدی المنتظر۔ ابن قیم، المنار وغیرہ (ناشر)۔

[1] وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا تاکہ اس کو ہر دوسرے دین پر غالب کرے خواہ مشرکین کتنا ہی برا کیوں نہ مانیں۔ (سورۂ توبہ۔ آیت ۳۳ اور سورۂ صف۔ آیت ۹)۔

[2] بلاشبہ ہم نے تورات کے بعد زبور میں لکھ دیا تھا کہ روئے زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہوں گے۔" (سورۂ انبیاء۔ آیت ۱۰۵)۔

[3] ہم نے یہ چاہا کہ جو لوگ زمین پر کمزور کر دیے گئے ہیں ان پر احسان کریں اور انہیں لوگوں کا پیشوا بنائیں۔ ہم یہ بھی چاہتے تھے کہ انہیں روئے زمین پر قدرت عطا کریں اور فرعون اور ہامان اور ان کے لشکروں کو انہیں کمزور لوگوں کے ہاتھوں وہ کچھ دکھائیں جس سے وہ بہت ڈرتے تھے۔ (سورۂ قصص۔ آیات ۵-۶)۔

[4] موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ خدا سے مدد مانگو اور صبر کرو۔ ساری زمین خدا کی ہی ہے اور وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے۔ بالآخر فتح پرہیزگاروں کی ہے۔ (سورۂ اعراف۔ آیت ۱۲۸)

ظہور کا انتظار

اس پیشین گوئی کے پورا ہونے کی آرزو کو اسلامی روایات میں "انتظار فرَج" کا نام دیا گیا ہے اور اسے عبادت ـــــ بلکہ افضل عبادت ـــــ گردانا گیا ہے۔ اس کی تائید اس اسلامی اور قرآنی اصول سے ہوتی ہے جس کے مطابق رحمت خداوندی سے ناامید ہونے کی ممانعت کی گئی ہے۔

حالات خواہ کیسے ہی ہوں مومنین اللہ کی عنایات پر یقین رکھتے ہیں اور کبھی ہمت نہیں ہارتے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ انتظار فرج اور رحمت خداوندی کسی خاص شخص یا گروہ سے مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ تمام بنی نوع انسان کے لیے اس کا فیض عام ہے۔ علاوہ ازیں اس ضمن میں اللہ کے خاص وعدوں نے اسے ایک یقینی امر بنا دیا ہے۔

انتظار کی دو صورتیں

خوش آئند اور خوشگوار مستقبل کے انتظار کی دو صورتیں ہیں۔ ان میں سے ایک صورت تعمیر کرنے والی، حفاظت کرنے والی، قوّت بخشنے والی اور حرکت و عمل پر آمادہ کرنے والی ہے۔ اسے حق پرستی اور ایک طرح کی عبادت قرار دیا جا سکتا ہے۔ دوسری صورت تخریبی اور مفلوج کن ہے جس سے نافرمانی، جمود اور تباہی پھیلتی ہے۔ یہ بجائے خود ایک گناہ ہے۔

انتظار کی یہ دو صورتیں حضرت امام مہدی علیہ السلام کے ظہور کے بارے میں دو مختلف نظریات کا براہ راست نتیجہ ہیں اور یہ نظریات

بجائے خود تاریخی تغیرات اور انقلابات کے بارے میں مختلف آراء کی بنا پر وجود میں آئے ہیں لہٰذا مناسب ہوگا کہ اس مقالے میں تاریخی انقلابات کا ایک سرسری جائزہ پیش کر دیا جائے۔

معاشرے کا وجود اور اس کی روش

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ آیا تاریخی تغیرات اتفاقی امور کا ایک سلسلہ ہوتے ہیں یا ترتیبی امور کا؟ درحقیقت فطرت میں کوئی چیز اتفاقی نہیں۔ بہ الفاظ دیگر کوئی مظہر کسی ضرورت یا علت کے بغیر وجود میں نہیں آتا۔ ہاں کچھ واقعات یقیناً نسبتی طور پر وجود میں آتے ہیں۔

فرض کیجیے کہ ایک صبح کو آپ گھر سے نکلیں اور آپ کی ملاقات ایک ایسے دوست سے ہو جائے جس سے ملے ہوئے برسوں گزر چکے ہوں اور وہ آپ کے گھر کے پاس سے گزر رہا ہو تو یہ ملاقات اتفاقی سمجھی جائے گی۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی طبعی قانون نہیں ہے کہ جس کی رو سے آپ کے گھر سے نکلنے کے نتیجے میں یہ ملاقات ضروری قرار پائے۔ تاہم یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ یہ ملاقات ایک خاص لمحے پر آپ کے اپنے گھر سے باہر آنے کا لازمی نتیجہ ہے۔

جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایک علت اور ایک معلول میں کوئی لازمی تسلسل موجود نہیں ہے تو اس کے نتیجے میں رونما ہونے والے واقعے کو ہم اتفاق کہتے ہیں۔ اتفاقی واقعات پر کسی عام یا خاص قاعدے کا اطلاق نہیں ہوتا اور وہ کسی سائنسی اصول کے تحت نہیں آتے کیونکہ سائنس کا تعلق فطرت کی عام روش سے ہے۔

ممکن ہے کوئی شخص یہ کہے کہ تاریخی تغیرات فقط ارتقائی حادثات کا ایک سلسلہ ہوتے ہیں اور ان پر کسی کلی و عمومی قاعدے کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اپنے اس نظریے کی تائید میں وہ یہ دلیل دے سکتا ہے کہ معاشرہ افراد کا ایک مجموعہ ہوتا ہے جن میں سے ہر فرد کا اپنا اپنا کردار اور اپنی اپنی خصوصیتیں ہوتی ہیں۔ افراد کے ذاتی رجحانات سے جو دافعات رونما ہوتے ہیں وہ سب مل کر اتفاقی حوادث کا ایک سلسلہ بن جاتے ہیں اور یہی اتفاقات تاریخی تغیرات کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔

ایک اور نظریے کی رو سے افراد سے الگ معاشرے کا ایک جداگانہ وجود ہوتا ہے اور وہ اپنی ساخت اور روش کے مطابق عمل کرتا ہے معاشرے کا وجود افراد کی طرح نہیں ہوتا بلکہ وہ لوگوں اور ان کے تہذیبی عمل اور ردّعمل سے تشکیل پاتا ہے۔ بے جان یا جاندار مرکبات میں سے ہر مرکب کی بھی یہی کیفیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرے کا اپنا ضمیر، خاصیت، روش، مزاج اور قاعدہ ہوتا ہے۔ یہ اپنی فطرت کے مطابق عمل کرتا ہے اور بعض عام اصولوں کے تحت اس کی وضاحت کی جا سکتی ہے۔

اسی بنا پر ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ معاشرے کا اپنا ایک مستقل وجود ہے کیونکہ اسی صورت میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ بھی اپنا ایک فلسفہ رکھتی ہے

اور اس پر کچھ قواعد وضوابط کا اطلاق ہوتا ہے۔ صرف اسی صورت میں تاریخ کہرے مطالعے کے قابل قرار پاتی ہے اور اس سے عبرت حاصل کرنا ممکن ہوتا ہے جس سے معاشرے کی علٰحدہ صورت اور خصوصیت ہوتی ہے۔ بصورت دیگر افراد کی زندگی کے منتشر واقعات کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آئے گا۔

اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ تاریخ کا اپنا کوئی کردار نہیں ہے تو پھر فقط لوگوں کی انفرادی زندگی زیر مطالعہ آتی ہے اور قوموں کی اجتماعی زندگی کا مطالعہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس صورت میں درس وعبرت صرف انفرادی زندگی تک محدود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے تاریخ اور تاریخی ارتقاء کے بارے میں دو مختلف نظریات ہیں جو اس مرکزی خیال کے گرد گھومتے ہیں کہ آیا "معاشرے کا اپنا کوئی وجود ہے یا نہیں؟"

قرآن اور تاریخ

اس مقالے کا عنوانِ بحث "انتظار مہدی" ایک فلسفیانہ اور اجتماعی موضوع ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اسلامی موضوع بھی ہے۔ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں یہ ایک قرآنی تصوّر ہے لہٰذا اس انتظار کی ماہیت بیان کرنے سے پہلے مناسب ہوگا اگر معاشرے اور اس کے مسلسل بدلتے ہوئے دھارے — تاریخ — پر قرآنی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی جائے۔

اس میں تو کوئی کلام نہیں کہ قرآن مجید تاریخ کو عبرت حاصل کرنے کا ایک وسیلہ، علم حاصل کرنے کا ایک ذریعہ اور تفکر و تذکر کے قابل ایک موضوع قرار دیتا ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن مجید تاریخ کو انفرادی

زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے یا اجتماعی نقطۂ نظر سے؟ نیز کیا یہ لوگوں کو نیکی کرنے اور بدی سے بچنے کی ترغیب دینے کے لیے افراد کی زندگیاں بطورِ نمونہ پیش کرتا ہے یا اس کی نظر فقط اجتماعی زندگی پر یا کم از کم انفرادی زندگی کے ساتھ ساتھ اجتماعی زندگی پر بھی ہے۔

مؤخر الذکر صورت میں کیا قرآن مجید سے یہ معلوم کرنا ممکن ہے کہ افراد سے الگ معاشرے کا اپنا کوئی مستقل وجود، روش، مدّتِ حیات حتیٰ کہ شعور، احساس اور اپنی کوئی قوّت ہے یا نہیں؟ اسی طرح قرآن مجید سے کیا یہ بھی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ معاشرے اور قومیں بھی کچھ مقررہ قوانین کی پابند ہوتی ہیں جن کا اطلاق ان سب پر یکساں طور پر ہوتا ہے یا نہیں؟

اس مختصر مقالے میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ ان مسائل پر مفصل بحث کی جائے تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ مذکورہ بالا تینوں سوالوں کا جواب اثبات میں ہے[1]

قرآن مجید گزشتہ قوموں کے حالات اور ان کی زندگی کی داستانیں بیان کرتا ہے تاکہ آنے والی نسلیں ان کے بارے میں غور و فکر کریں اور ان سے عبرت حاصل کریں۔

سورۂ بقرہ کی آیات ۱۳۴ - ۱۴۱ میں ارشاد خداوندی ہے۔ "وہ لوگ جو گزر چکے ہیں، انہوں نے جو عمل کیا وہ ان کے لیے تھا، اور جو عمل تم

---

[1] ملاحظہ فرمائیں: حضرت علامہ محمد حسین طباطبائیؒ کی تفسیر المیزان جلد ۴۔ صفحہ ۱۰۲، جلد ۷ صفحہ ۳۳۳، جلد ۴ - صفحہ ۸۵، جلد ۱۰ - صفحہ ۷۱، جلد ۱۸ - صفحہ ۱۹۱ -

نے انجام دیا ہے وہ تمہارے لیے ہے۔ تم سے اس بارے میں باز پرس نہیں ہو گی کہ انہوں نے کیا کچھ کیا۔" (یعنی تم صرف اپنے اعمال کے ذمہ دار ہو)۔

قرآن مجید قوموں کی زندگی اور ان کی مدّت حیات کا بار بار ذکر کرتا ہے۔ سورۂ اعراف آیت ۳۴ اور سورۂ نحل آیت ۶۱ میں بتایا گیا ہے کہ:

"ہر قوم کی ایک مدّت حیات ہے پس جب اس کی عمر ختم ہونے کو آتی ہے تو اس میں ایک لمحہ تک کی تقدیم و تاخیر نہیں ہوتی۔"

ارادہ اور مشیت کی قوّتیں تاریخ کے مقدر کو بدل سکتی ہیں۔ اس خیال کی قرآن مجید پُرزور تردید کرتا ہے۔ وہ واضح طور پر بتاتا ہے کہ قوموں کی تقدیر فطرت کے پائدار اور ناقابلِ تغیر قاعدے کے مطابق بنتی اور بگڑتی ہے۔ سورۂ فاطر کی آیت ۴۳ میں کہا گیا ہے:

"کیا وہ لوگ اسی دستور کے منتظر ہیں جو اگلوں کے ساتھ ہوتا آیا ہے۔ تم سنت الٰہی[1] میں کوئی تبدیلی (ایک سنت کی بجائے دوسری سنت آجائے) نہیں پاؤ گے اور نہ اس میں کوئی تغیر (ایک سنت کا دگرگوں ہو جانا) پاؤ گے۔"

قرآن مجید ایک غیر معمولی نکتے کی طرف توجہ مبذول کراتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ لوگوں کو اپنے اعمال اور کردار کا جائزہ لے کر اور سنت الٰہی کو دیکھ کر سمجھ لینا چاہیے کہ ان کی قسمت میں کیا لکھا ہے کیونکہ جو قوّتیں ان کی قسمت کا تعین کرتی ہیں وہ خود ان کے اپنے ہی اعمال کے نتائج کا ایک سلسلہ ہیں۔ دوسرے الفاظ میں مخصوص اجتماعی اعمال کا مخصوص نتیجہ

---

[1] ملاحظہ ہو جامعہ تعلیمات اسلامی کی کتاب تاریخ عاشورا

برآمد ہوتا ہے لہٰذا گو تاریخ کا رُخ مشیت الٰہی سے متعین ہوتا ہے لیکن ایک خود مختار فاعل کی حیثیت سے انسان کے کردار کو بھی اس سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن مجید کی بہت سی آیات اس موضوع کی جانب اشارہ کرتی ہیں۔ ہم ذیل میں ان میں سے ایک آیت نقل کرتے ہیں:

"خدا کسی قوم کی حالت کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی روش کو بدل نہ دے۔" (سورۂ رعد۔ آیت ۱۱)

تاریخ کے ارتقاء کی توجیہہ

جو لوگ معاشرے کو "مستقل وجود" رکھنے کی بنا پر متحرک، مائل بہ کمال اور بالیدگی سے آشنا قرار دیتے ہیں وہ معاشرے کی تکمیل سے کیا مراد لیتے ہیں؟ یعنی یہ مکتب معاشرے کو کس جہت سے کمال کے حصول کی جانب رواں دواں دیکھتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ مکتب معاشرے کے حصول کمال کی کیا تشریح کرتا ہے۔

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ قرآن مجید کس طرح معاشرے کے جداگانہ وجود کی اہمیت اور اس کے ارتقاء پر زور دیتا ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ بعض دوسرے مکاتب جن میں سے معدودے چند اب بھی باقی ہیں اسی خیال کے حامی رہے ہیں اور ہیں۔ تاہم ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ قرآن مجید اور ان دوسرے مکاتب کے نقطۂ نظر کے مطابق تاریخ کا ارتقاء کس طرح وقوع پذیر ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں انسان کی کیا ذمے داریاں ہیں اور اس کا ممکنہ کردار کیا ہے، بالخصوص مہدیٔ موعود کے "عظیم انتظار" کی کیا صورت ہونی چاہیے۔

دو مختلف نظریے

تاریخی ارتقاء کی تعبیر میں دو مختلف نظریے پائے جاتے ہیں ان میں سے ایک "جدلیاتی[1]" اور دوسرا "انسانی" کہلاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں تاریخ کے ارتقاء کے بارے میں دو مختلف اندازہائے فکر ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے مطابق "عظیم انتظار" ایک علٰیحدہ صورت بلکہ ایک خاص ماہیت پیدا کر لیتا ہے۔

ہم ان دونوں اندازہائے فکر کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں لیکن صرف اس حد تک جس حد تک یہ سوال انتظار اور مستقبل کے لیے امید سے مربوط ہے۔

ہم فطرت کی جدلیاتی تعبیر کی کچھ وضاحت کرنا چاہتے ہیں جو تاریخ کی مادّی تعبیر کی بنیاد ہے۔

۱۔ اس نظریے کے مطابق فطرت کی ہر چیز مسلسل حرکت کر رہی ہے اور اگلے مرحلے پر پہنچنے کی جدّوجہد میں مصروف ہے۔ کوئی چیز ساکن

---

[1] جدلیات: فلسفہ کی ایک شاخ جس میں مابعدالطبیعی تضادات اور ان کے حل اور معاشرتی قوّتوں کے تصادم اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج پر بحث کی جاتی ہے۔ انگریزی لفظ Dialectics کا ترجمہ

جدلیاتی مادیت: کارل مارکس اور اینگلز کا وہ نظریہ جس کے مطابق سیاسی واقعات، معاشرتی قوّتوں یعنی طبقاتی کشمکش کا نتیجہ ہوتے ہیں جو انسان کی مادی ضروریات سے پیدا ہوتی ہے

اور غیر متحرک نہیں ہے لہٰذا فطرت کا صحیح ادراک حاصل کرنے کے لیے اشیاء اور مظاہر کا اس حالت میں مطالعہ ضروری ہے جب کہ وہ حرکت میں ہوں اور بدل رہے ہوں۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ چونکہ ہماری سوچ بھی فطرت کا ایک حصہ ہے اس لیے وہ بھی مسلسل تبدیل ہو رہی ہے۔

۲۔ فطرت کا ہر جزو دوسرے اجزاء سے اثر قبول کرتا ہے اور خود بھی انہیں متاثر کرتا ہے۔ تمام کائنات عمل اور ردِّ عمل کی زنجیر میں جکڑی ہوئی ہے۔ تاہم فطرت کے تمام اجزاء کے مابین مکمّل ہم آہنگی موجود ہے۔ پس صحیح طریق کار یہ ہے کہ فطرت کی ہر چیز کا مطالعہ اسے دوسری چیزوں سے الگ کر کے نہیں بلکہ ان کے ساتھ اس کے تعلق کی روشنی میں کیا جائے۔

۳۔ حرکت تضاد سے پیدا ہوتی ہے۔ تضاد ہی ہر حرکت اور تبدیلی کی بنیاد ہے جیسا کہ یونانی فلسفی "ہراکلیٹ" HERACULITUE نے ڈھائی ہزار سال پہلے کہا تھا "کشمکش ترقی کی ماں ہے"۔ فطرت میں تضاد کا مطلب یہ ہے کہ ہر چیز فطری طور پر اپنی ضد کی طرف مائل ہوتی ہے اور Antithesis کو اپنے اندر پالتی ہے۔ ہر اس چیز کے ساتھ جو وجود رکھتی ہے اس کے تباہ کرنے والے عوامل بھی موجود ہوتے ہیں یعنی وہ عوامل بھی ہوتے ہیں جو اسے موجودہ شکل میں برقرار رکھنا چاہتے ہیں اور وہ بھی جو اسے اس کی ضد میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

۴۔ یہ اندرونی کشمکش بڑھتی رہتی ہے تا آنکہ یہ ایک ایسے مرحلے پر

پہنچ جائے جہاں ایک انقلاب اچانک وقوع پذیر ہو جاتا ہے۔ جب کشمکش اس مرحلے پر پہنچتی ہے تو نئی قوتوں کو فتح نصیب ہوتی ہے اور پرانی قوتیں شکست کھا جاتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ چیز مکمل طور پر اپنی ضد میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

اس تبدیلی کے بعد وہی عمل دوبارہ شروع ہو جاتا ہے کیونکہ یہ مرحلہ دوبارہ اپنے اندر ضد کی پرورش کرتا ہے اور مزید اندرونی کشمکش کا نتیجہ ایک تازہ قلبِ ماہیت کی شکل میں نکلتا ہے۔ تاہم اس مرتبہ وہ چیز اپنی اصلی شکل اختیار نہیں کرتی بلکہ ایک ایسی حالت میں تبدیل ہو جاتی ہے جو کہ پہلے اور دوسرے مرحلے کا ایک قسم کا امتزاج ہوتی ہے اس تیسرے مرحلے کو Synthesis کہا جاتا ہے فطرت اپنی اصلی شکل یعنی Thesis سے Antithesis کی جانب اور بالآخر Synthesis کی جانب حرکت کرتی ہے اور ایک چکر مکمل کر لینے کے بعد دوبارہ اسی ارتقائی راستے پر چلنے لگتی ہے۔

فطرت کی اپنی نہ کوئی منزل ہے اور نہ یہ کمال کی طرف گامزن ہے بلکہ اس کا میلان اپنی فنا کی جانب ہے۔ تاہم چونکہ ہر تضاد اپنے تضاد کی جانب جھکتا ہے اس لیے یہ عمل مجبوراً Synthesis کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس کی بنا پر ارتقاء ناگزیر ہو جاتا ہے۔ یہ وہ طرزِ فکر ہے جسے فطرت کی جدلی تعبیر کہا جاتا ہے۔

تاریخ چونکہ فطرت کا ایک حصہ ہے اس لیے اس قانون کا اطلاق اس پر بھی ہوتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہ جن عناصر پر مشتمل ہے وہ انسان ہیں۔ تاریخ ایک مسلسل عمل ہے جو انسان اور فطرت نیز انسان اور معاشرے کے مابین تعلقات سے متاثر ہوتا ہے۔ ترقی پذیر اور زوال پذیر گروہوں

کے مابین مسلسل کشمکش جاری رہتی ہے۔ یہ کشمکش جسے بالآخر اضداد کی جدّوجہد کہا جا سکتا ہے ایک شدید اور انقلابی عمل میں سے گزرنے کے بعد ترقی پذیر قوّتوں کے حق میں ختم ہو جاتی ہے۔ اس جدّوجہد کے دوران ہر واقعے کے بعد اس کا تضاد رونما ہوتا ہے اور یہ عمل ارتقاء کے مکمل ہونے تک جاری رہتا ہے۔

جدلیاتی مادیت کا نظریہ

کچھ لوگ تاریخ کی تعبیر ایک ضد کے دوسری ضد میں تبدیل ہو جانے کے زاویۂ نگاہ سے کرتے ہیں۔ وہ لوگ فقط تاریخ کی ہی نہیں بلکہ تمام تر فطرت کے ارتقاء کی توجیہہ بھی اسی بنیاد پر کرتے ہیں لہٰذا تاریخ کی جدلیاتی تعبیر کی تشریح کرنے سے پہلے دیکھنا یہ چاہیے کہ انسانی زندگی کی اساس اور اس کی تاریخ کو متحرک رکھنے والی قوّت پیداواری عمل ہے اور یہ قوّت ترقی کے ہر مرحلے پر پیداواری عمل کے فروغ کے لیے لوگوں کے درمیان مخصوص اقتصادی تعلقات کو جنم دیتی ہے اور یہ تعلقات بہت سے دوسرے روابط (مثلاً اخلاقی، سیاسی، قانونی اور خاندانی) کا تقاضا کرتے ہیں لیکن پیداوار کا یہ عمل ترقی کے کسی خاص مرحلے پر نہیں رکتا اس لیے انسان جو اوزار ساز ہے، خود اوزار بھی اسے ایک نئے انسان کا روپ بخشتے ہیں اور وہ پیداوار میں اضافے کے ساتھ ساتھ نئے نظریات اور حصولِ کمال کے لیے آگے بڑھتا رہتا ہے اس طرح بار دیگر اقتصادی تعلقات اور ان کے نتیجے میں سماجی رابطے مزید ترقی کرتے ہیں

اور یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔

اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ اقتصاد ایک معاشرتی اساس ہوتی ہے اور تمام دوسرے تعلقات اس کے تابع ہوتے ہیں۔ جب ذرائع پیداوار میں ترقی اور پیداوار میں اضافے کے سبب معاشرے میں کوئی تبدیلی آتی ہے تو پورے معاشرتی ڈھانچے کو تبدیل کرنا ضروری ہو جاتا ہے لیکن معاشرے کا وہ طبقہ جس کا مفاد پرانے اقتصادی نظام سے وابستہ ہوتا ہے اس تبدیلی کو اپنے خلاف سمجھتا ہے اور موجودہ نظام ہی کو برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ اس کے برعکس ابھرتا ہوا طبقہ جو نئے ذرائع پیداوار کو اپنے مفاد میں سمجھتا ہے وہ معاشرے اور اس کے کاروبار کو آگے بڑھانے کی سرتوڑ کوشش کرتا ہے تاکہ اسے جدید اور ترقی یافتہ ذرائع پیداوار سے ہم آہنگ کر سکے۔

معاشرے کے یہ دو گروہ جن میں سے ایک رجعت پسند اور دوسرا ترقی پسند ہوتا ہے ان کے درمیان کشمکش جاری رہتی ہے اور بڑھتے بڑھتے تصادم تک پہنچ جاتی ہے اور معاشرہ ایک انقلابی گروہ کے ساتھ قدم بہ قدم آگے بڑھتے ہوئے یکسر تبدیل ہو جاتا ہے۔ پرانا نظام، نئے نظام کے لیے جگہ خالی کر دیتا ہے اور یوں یہ عمل جدید قوتوں کی فتح اور قدیم قوتوں کی مکمل شکست پر منتج ہوتا ہے اور تاریخ ایک نئے مرحلے میں داخل ہو جاتی ہے۔

اس نئے مرحلے کو بھی ایسے ہی حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ذرائع پیداوار کی مزید ترقی کے نتیجے میں نئے افراد میدان میں آتے ہیں۔ پیداوار میں اضافے سے مروجہ نظام سماجی مسائل حل کرنے کے لیے اپنی افادیت کھو بیٹھتا ہے اور معاشرہ دوبارہ تضاد سے دوچار ہو جاتا ہے۔ اقتصادی اور معاشرتی نظام میں بار دیگر ایک بہت بڑی تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

تب یہ مرحلہ بھی اپنے تضاد کے لیے جگہ چھوڑ دیتا ہے اور پھر ایک نیا مرحلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یوں تبدیلی اور ترقی کا یہ عمل مسلسل جاری رہتا ہے۔

فطرت کی طرح تاریخ بھی تضادات میں سے گزرتی ہے یعنی اس کے ہر مرحلے میں دوسرے مرحلے کے اسباب موجود ہوتے ہیں اور تصادم کے ایک سلسلے کے بعد پہلا مرحلہ دوسرے مرحلے کے لیے جگہ خالی کر دیتا ہے۔

فطرت اور تاریخ کے بارے میں اس انداز فکر کو "نظریۂ جدلیات" کہا جاتا ہے جس کی رُو سے دوران تاریخ کی تمام معاشرتی اقدار ان ہی ذرائع پیداوار سے وابستہ اور ان کے تابع رہی ہیں۔

اصلی خصوصیت

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ فطرت اور تاریخ کی توجیہہ کے بارے میں نظریہ جدلیت کی وہ اصلی خصوصیت کیا ہے جو اسے دیگر نظریات اور خاص طور پر مابعد الطبیعی نظریے سے ممتاز کرتی ہے۔ کیا اس نظریے کی خصوصیت یہی ہے کہ نظریۂ جدلیات کے حامی کہتے ہیں کہ فطرت اور اشیاء ہمیشہ حرکت میں رہتی ہیں اور بقول ان کے مابعد الطبیعی نظریے کے قائل لوگ انہیں ساکن اور بے حرکت قرار دیتے ہیں۔ نظریۂ جدلیات کے بہت سے حامیوں کی تحریرات اور بیانات سے یہ بات سامنے آتی ہے تاہم حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اس نظریے کے حامی جن لوگوں کو الٰہیاتی نظریے کے طرفدار قرار دیتے ہیں وہ بھی کائنات اور اس میں موجود اشیاء کو ساکن اور بے حرکت نہیں سمجھتے اور انتہائی محتاط نظریات کے مطابق وہ ہمیشہ ارتقاء کی منزل میں ہے۔ ان کے یہاں "سکون" کی اصطلاح کا استعمال نسبتی ہے اور فقط مابعد الطبیعی چیزوں کو

ساکن کہا جا سکتا ہے۔

بدقسمتی سے نظریۂ جدلیات کے طرفدار چونکہ اس اصول کی پیروی کرتے ہیں کہ مقصد حصول مقصد کے وسائل کو جائز کر دیتا ہے اس لیے وہ اپنی توجہ اپنے مقاصد کے حصول پر مرکوز رکھتے ہیں اور ایسا کرتے ہوئے وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ آیا جو چیز وہ دوسروں سے منسوب کر رہے ہیں وہ صحیح بھی ہے یا نہیں؟ بہرحال حرکت کا اصول جدلی طرزِ فکر کا طرۂ امتیاز نہیں ہے۔

کیا نظریۂ جدلیات کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اشیاء کے باہمی تعلق اور ان کے باہم متاثر ہونے اور متاثر کرنے کا قائل ہے اور صرف اسی نظریہ کے حامی یہ دعوے کرتے ہیں۔ بقول ان کے مابعد الطبیعی نظریے کے قائل لوگ اشیاء کو باہم بے تعلق اور غیر مؤثر قرار دیتے ہیں۔ تاہم ان کا یہ کہنا بھی غلط ہے کیونکہ مابعد الطبیعی طرزِ فکر کے حامی بھی چیزوں کو باہم نہ غیر متعلق سمجھتے ہیں اور نہ غیر مربوط۔

کیا نظریۂ جدلیات کا اہم اصول "تضاد" ہے اور نظریۂ الٰہیات کے حامل فطرت میں "تضاد" کی موجودگی کا انکار کرتے ہیں۔ یہی وہ نکتہ ہے جس پر جدلیات کے علمبرداروں نے ایک شورِ بے ہنگام برپا کر رکھا ہے اور منطق اور فلسفے کی اصطلاح "امتناع جمع و رفع نقیضین" کو فطرت یا معاشرہ اور تاریخ میں تضاد کی بنیاد قرار دیتے ہیں حالانکہ یہ اصول "تضاد" کے ساتھ کسی بھی طرح کا ربط نہیں رکھتا۔ بہرحال وہ ایک قدم آگے بڑھ کر یہ بھی کہتے ہیں کہ مابعد الطبیعی طرزِ فکر کے حامی اس نظریے کی وجہ سے کہ فطرت کے تمام اجزاء حتیٰ کہ آگ اور پانی جیسی متضاد اشیاء بھی ایک دوسری سے مربوط ہیں۔ معاشرے کے مختلف عناصر کو صلح کی دعوت دیتے ہیں اور اس بنا پر مظلوموں کو اس امر پر آمادہ کرتے ہیں کہ وہ ظالموں کا مقابلہ نہ کریں اور صلح و سلامتی کا طریقہ اپنائیں۔

ہم ایک مرتبہ پھر کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی کوشش ہے۔ مابعد الطبیعی طرزِ فکر کے موئدین کے مطابق مختلف طبیعی عناصر کے درمیان کشمکش کے معنوں میں تضاد موجود ہے اور یہ اللہ تعالےٰ کی نعمتوں کے ہمیشہ جاری رہنے کی ایک لازمی شرط ہے[1]

کیا فطرت میں تغیر و تبدل اور تاریخ میں انقلاب کا اصول نظریۂ جدلیات کی اہم خصوصیت ہے؟ جدلیاتی نظریے کے بانی ہیگل اور جدلی مادیت کے ہیرو کارل مارکس نے "امتناع. جمع و رفع نقیضین" کو جدلیاتی اصول کے طور پر پیش نہیں کیا۔ ہاں انیسویں صدی میں اسے حیاتیات کے ارتقائی اصولوں میں سے ایک اصول کے طور پر تسلیم کیا گیا اور فریڈرک اینگلز نے جو مارکس کا شاگرد تھا اسے جدلیاتی فلسفہ کے اصولوں میں شامل کیا۔ آج کل یہ علم حیاتیات کا ایک مسلمہ اصول ہے اور اس پر کسی مکتب فکر کی اجارہ داری قائم نہیں ہو سکتی۔ اندریں حالات یہ سوال اپنی جگہ پر برقرار رہتا ہے کہ نظریۂ جدلیات کی خصوصیتِ خاصہ کیا ہے؟ درحقیقت دو باتوں کو اس طرزِ فکر کی امتیازی خصوصیت اور حقیقی اساس قرار دیا جا سکتا ہے۔

ان میں سے ایک اصول یہ ہے کہ فقط بیرونی حقائق ہی نہیں بلکہ خیالات بھی جدلی نوعیت کے ہوتے ہیں یعنی خیالات پر بھی مذکورہ بالا چار اصولوں کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس مفروضے میں کوئی دوسرا مکتب فکر ان کا ہمنوا نہیں ہے[2]

---

[1] ملاحظہ ہو مصنف کا اصل مقالہ "تضاد در فلسفۂ اسلامی"، مطبوعہ دانشکدۂ الٰہیات و معارف اسلامی۔ تہران۔

[2] حضرت علامہ سید محمد حسین طباطبائی نے اپنی کتاب، اصول فلسفہ و روش رئالیسم کی جلد اول میں 'نسبت' کے موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

اس طرزِ فکر کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ تضاد کی تعبیر ان معنوں میں کرتا ہے کہ ہر چیز لازمی طور پر اپنے تضاد کی پرورش اپنے اندر کرتی ہے اور پھر خود اسی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور پھر وہ نئی چیز بھی اسی عمل میں سے گزرتی ہے۔ اس نظریے کے مطابق اس اصول کا اطلاق فطرت اور تاریخ دونوں پر ہوتا ہے اور یہ دونوں بھی تضاد کے اس عمل سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ نیز یہ کہ ارتقاء کے معنی دو متضاد چیزوں کے اتحاد کے ہیں جن میں سے ایک، دوسری میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

فطرت کے مختلف اجزاء میں کشمکش اور بعض اوقات ان کے متحد ہو جانے کے معنوں میں تضاد کا نظریہ بہت پرانا ہے۔ جدلیاتی فلسفہ نے جو نیا تصور پیش کیا ہے وہ اس کا یہ دعوےٰ ہے کہ فطرت کے مختلف اجزاء میں باہم تضاد اور کشمکش کے علاوہ خود ہر جزو میں بھی تضاد پایا جاتا ہے جو نئے ترقی پذیر اور پرانے زوال پذیر عناصر کے درمیان ایک جنگ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ جس میں "آخری فتح" ترقی پذیر عناصر کی ہوتی ہے۔ یہ دو خصوصیتیں جدلی طرزِ فکر کی عمارت کے بنیادی پتھر ہیں۔

لہٰذا ہر اس مکتب کو جو حرکت اور تضاد کے اصولوں کا قائل ہو فلسفۂ جدلیات کا حامی سمجھنا قطعاً غلط ہے۔ ایسی ہی غلطی ان لوگوں نے کی ہے جنہوں نے اسلامی تعلیمات میں حرکت، تغیر اور تضاد کے اصول موجود پا کر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اسلامی اندازِ فکر بھی جدلیات کا حامی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جدلی انداز فکر کے مطابق تمام صداقتیں وقتی اور نسبتی ہیں جب کہ اسلام بہت سی دائمی اور جاودانی حقیقتوں پر یقین رکھتا ہے۔

علاوہ ازیں اس نظریہ پر یقین رکھنے کا لازمہ یہ ہے کہ فطرت اور تاریخ ایک مثلث Thesis-Antithesis-Synthesis کی شکل میں حرکت کرتی ہیں یعنی تضادات کے عمل سے گزرتی ہیں۔ تاہم اسلامی تعلیمات اس مطلب سے موافقت نہیں رکھتیں۔ یہ غلط فہمی دراصل جدلیاتی مادیت کے حامیوں نے پیدا کی ہے۔ وہ اپنے مقالوں میں جو پراپیگنڈے کے عناصر سے کبھی پاک نہیں ہوتے نظریۂ جدلیت کے علاوہ ہر طرزِ فکر کو مابعد الطبیعی طرزِ فکر کا نام دیتے ہیں جس میں ان کے بقول فطرت کے تمام اجزاء ساکن، ایک دوسرے سے غیر مربوط اور ہر قسم کے تضاد سے خالی ہیں۔ وہ ارسطو کی صوری منطق پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ اس کی بنیاد انہی تین اصولوں پر ہے۔ وہ اپنی اس رائے پر اس قدر اصرار کرتے ہیں کہ جن لوگوں کی براہ راست معلومات کم ہوں وہ اکثر بھٹک جاتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ جو لوگ ان کے اقوال سے متاثر ہوتے ہیں اگر وہ اسلامی علم و دانش سے بے بہرہ ہوں تو بڑی آسانی سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ بے حرکتی، لاتعلقی اور عدم تضاد کے اصول اسلامی طرزِ فکر کی بنیاد ہیں۔ اس بارے میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ چونکہ اسلام ایک دین ہے اس لیے اس کی بنیاد مابعد الطبعیات پر ہے اور اسی بنا پر اس کا طرز فکر مابعد الطبعیاتی ہونا چاہیے اور چونکہ مذکورہ طرزِ فکر مندرجہ بالا

تین اصولوں پر مبنی ہے۔ لہٰذا ان پر ایمان اسلامی طرز فکر کا ایک حصّہ ہونا چاہیے۔

ایک دوسرا گروہ ان لوگوں پر مشتمل ہے جو اسلامی تعلیمات سے کم و بیش آگاہ ہے۔ وہ مذکورہ تین اصول ان تعلیمات میں نہیں پاتے بلکہ اس کے برعکس صورت کا مشاہدہ کرتے ہیں لیکن یقین رکھتے ہیں کہ مابعد الطبعیاتی طرز فکر انہی تین اصولوں پر مبنی ہے۔ وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ چونکہ اسلامی طرزِ فکر مابعد الطبعیاتی نہیں ہے اس لیے اسے جدلیاتی نظریہ سے ہم آہنگ ہونا چاہیے وہ لوگ چونکہ کسی تیسرے مکتبِ فکر کے قائل نہیں ہیں اس لیے قدرتی طور پر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں۔

یہ تمام تر غلط فہمی اور الجھاؤ ان چیزوں پر بے جا اعتماد کی وجہ سے ہے جو جدلیاتی مادیت کے مؤیدین دوسروں سے منسوب کرتے ہیں۔ بہرحال جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے جو کچھ وہ کہتے ہیں حقیقت اس سے مختلف ہے۔ جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے اس سے ہم درج ذیل نتائج اخذ کرتے ہیں۔

(ا) قدیم و جدید کا مفہوم

موجودہ سلسلہ بیان میں قدیم و جدید کے الفاظ سے مراد نئی نسل اور پرانی نسل نہیں ہے اور ان کا نام نہاد نسلی خلاء Generation Gap سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ نوجوان نسل ہمیشہ انقلابی تحریک کی حمایت کرتی ہے اور پرانی نسل لازمی طور پر قدامت پسند ہوتی ہے۔ اسی طرح اس کا استعمال یہاں اپنے لغوی معنوں میں بھی نہیں ہے۔ نہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مقابلہ تعلیم یافتہ اور ان پڑھ لوگوں کے درمیان ہے بلکہ یہ الفاظ صرف

سماجی اور اقتصادی طبقات کی تعبیر کے لیے استعمال ہوئے ہیں اور ان سے مراد صرف دو طبقوں کے درمیان کشمکش کے ہیں جن میں سے ایک موجودہ نظام سے فائدہ اٹھا رہا ہے اور دوسرا طبقہ جو نئے پیداواری آلات کے استعمال میں مہارت رکھتا ہے اور مفادات سے محروم ہے موجودہ سماجی ڈھانچے میں تبدیلی لانے کا خواہشمند ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ معاشرے کے دو طبقوں کے درمیان مقابلہ ہے جن میں سے ایک کو ترقی پسند اور روشن خیال کہا جاتا ہے اور دوسرا تنگ نظر کہلاتا ہے جو معاشرے کی موجودہ صورت کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

چونکہ انسان کے سماجی انداز فکر پر اس کی طبقاتی حیثیت اور ماحول کا اثر پڑتا ہے اس لیے مراعات یافتہ طبقہ جو موجودہ نظام سے فائدے حاصل کرتا ہے۔ لازمی طور پر فکری جمود کا شکار ہو جاتا ہے اور حالات میں کسی تبدیلی کو پسند نہیں کرتا۔ اس کے برعکس محروم طبقہ جس کا استحصال کیا جاتا ہے وہ زور و شور سے فکری تحریک شروع کرتا ہے۔ یہ صورتِ حال رسمی تعلیم حاصل کرنے یا نہ کرنے سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ اکثر و بیشتر ترقی پسند تحریکوں کی ابتداء وہ لوگ کرتے ہیں جو تعلیمی لحاظ سے پسماندہ ہوتے ہیں لیکن اپنی طبقاتی حیثیت کی بنا پر باشعور ہوتے ہیں۔

(ب) تاریخ کا منطقی تسلسل

تاریخ کے ارتقائی مراحل ایک فطری اور منطقی بندھن کے ذریعے ایک دوسرے سے منسلک ہوتے ہیں اور ادھر ادھر نہیں ہو سکتے۔ ہر مرحلے کا اپنا ایک مخصوص مقام ہوتا ہے اور اسے آگے پیچھے نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً

سرمایہ دارانہ نظام، جاگیردارانہ نظام اور اشتراکی نظام کی درمیانی کڑی ہے اور ایک معاشرے کے لیے یہ ممکن نہیں کہ سرمایہ دارانہ مرحلے سے گزرے بغیر جاگیردارانہ نظام سے ہی براہِ راست اشتراکیت تک جا پہنچے۔ یعنی دو مقامات کے درمیانی نقطہ کو عبور کیے بغیر ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچ جائے جسے قدیم فلسفی 'طفرہ' (چھلانگ لگانے) سے تعبیر کرتے تھے۔ ایسا واقعہ اس صورت حال سے مشابہ ہوگا، جیسے انسانی نطفہ جنین کے مرحلے سے گزرے بغیر وضع حمل کے مرحلے پر پہنچ جائے یا ایک نومولود لڑکپن سے گزرے بغیر نوجوان بن جائے یا یوں کہیے کہ احمد جو حسن کا بیٹا ہے اپنے باپ کی پیدائش سے قبل ہی پیدا ہو جائے۔

یہی وجہ ہے کہ اس فلسفے کے حامی ان ابتدائی سوشلسٹوں کو جو تاریخ کے جبر اور اس کے مختلف مراحل کے منطقی تسلسل کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کی بنیاد محض نظریے IDEALOGY پر رکھنا چاہتے تھے، انہیں مثالیت پسند IDEALIST اور ان کے سوشلزم کو محض ایک تخیل قرار دیتے ہیں۔ تاہم ابتدائی سوشلزم کے برعکس مارکسزم کی بنیاد تاریخی مراحل کے منطقی تسلسل پر ہے۔

(ج) ہر مرحلے کا نقطۂ عروج

صرف یہی نہیں کہ اچانک تغیر اور کئی مراحل کا ایک جست میں عبور کرنا ممکن نہیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ارتقائی عمل کا ہر مرحلہ بجائے خود اپنے فطری کمال تک پہنچ جائے تاکہ وہ اپنی ضد میں تبدیل ہو کر ارتقائی عمل کی آخری شکل اختیار کرے۔ مثال کے طور پر جاگیردارانہ یا سرمایہ دارانہ نظام کو ہی لیجیے۔

اس کا ایک معیّن راستہ ہے جس کا بتدریج طے کرنا ضروری ہے تاکہ ایک خاص تاریخی لمحے پر ایک تبدیلی وقوع پذیر ہو جائے۔ کسی مرحلے کے نقطۂ عروج پر پہنچنے سے پہلے اس کے بعد کا مرحلہ آجانے کی توقع رکھنا ایسا ہی ہے جیسا کہ جنین کے مختلف مراحل طے کرنے سے پہلے کسی بچے کے تولد ہونے کا انتظار کیا جائے۔ ایسی صورت میں جو نتیجہ نکلے گا وہ ایک صحت مند بچے کی پیدائش نہیں بلکہ اسقاط حمل ہوگا۔

(د) جنگ کا مقدس ہونا

قدیم و جدید کے مابین جنگ تاریخ کے ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے تک پہنچنے کی بنیادی شرط ہے اور انسانی معاشرے کے ارتقاء کا ایک لازمی عامل ہے۔ اس قسم کی جنگ ہمیشہ مقدس ہوتی ہے۔ اسی طرح پرانے عناصر خواہ کوئی زیادتی نہ کریں تب بھی ان کا خاتمہ روا ہے کیونکہ ایسا کیے بغیر معاشرے کا ارتقاء ممکن نہیں۔ اس منطق کی بنا پر یہ ضروری نہیں کہ جنگیں ہمیشہ دفاعی ہوں یا ان کے ذریعے جارحیت کا سدِّباب کیا جائے۔

تفرقہ پیدا کرنا

فقط قدیم اور جدید طبقوں کی باہمی کشمکش ہی مقدس اور مباح نہیں بلکہ اس کے علاوہ ہر وہ اقدام بھی پسندیدہ ہے جو انقلاب کی راہ ہموار کرے اور ارتقائی عمل کی رفتار کو تیز کر دے۔ پس وہ تمام تخریبی اور تفرقہ انگیز کارروائیاں مقدس ہیں جو بددلی اور بے اطمینانی پھیلانے، اختلافات کی خلیج کو وسیع کرنے اور کشمکش کو ہوا دینے کے لیے کی جائیں۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ

چکے ہیں ارتقاء کا انحصار ایک تضاد سے دوسرے تضاد میں تند و تیز انقلابی تغیر پر ہوتا ہے اور ایسی تبدیلی اس وقت تک وقوع پذیر نہیں ہوتی جب تک اندرونی کشمکش اپنے نقطۂ عروج پر اور اختلافات اپنی آخری حد تک نہ پہنچ جائیں لہٰذا جو چیز ان اختلافات کو وسیع تر کرے وہ معاشرے کی ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے میں تبدیلی کی رفتار کو تیز کرتی ہے۔ چونکہ بدامنی اور فتنہ و فساد سے یہ مقصد پورا ہوتا ہے، اس لیے نظریۂ جدلیت کے مطابق یہ مفسدے جائز قرار پاتے ہیں۔

اصلاحات

نظریۂ جدلیت کے نقطۂ نگاہ سے تفرقہ اندازی کے مقابلے میں جزوی اصلاحات بھی یعنی لوگوں میں صلح و آشتی پیدا کرنا یا ان کی شکایات کے ازالے کے لیے کوئی اقدام کرنا غداری، بے وفائی اور غلط روی کے مترادف ہے بلکہ ایسے اقدامات کو معاشرتی ترقی کا راستہ روکنے اور ارتقائی عمل کے دشمنوں کے ساتھ مل جانے کے برابر جرم سمجھا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اصلاحی اقدامات کم از کم وقتی طور پر اختلافات کی خلیج کو کسی حد تک پاٹ دیتے ہیں جس سے کشمکش میں کمی آجاتی ہے۔ اختلافات میں کمی اور نا اتفاقیوں کے گھٹ جانے سے تصادم کا پہلو کمزور پڑ جاتا ہے جس سے انقلاب برپا کرنے میں تاخیر واقع ہو جاتی ہے۔ انقلاب میں تاخیر معاشرے کو اگلے مرحلے میں داخل ہونے سے روکنے اور ارتقائی عمل کو پسِ پشت ڈال دینے کے مترادف ہے۔ یہ ہیں وہ نتائج جو جدلیاتی نظریۂ تاریخ سے حاصل ہوتے ہیں۔

تاریخ ۔ انسانی نقطۂ نظر سے

تاریخ کے بارے میں فطری یا انسانی نقطۂ نظر جدلیاتی نقطۂ نگاہ سے قطعی طور پر مختلف ہے۔ یہ افراد اور معاشرے ہر دو کے بارے میں انسان اور انسانی قدروں کو بنیادی اہمیت دیتا ہے نفسیاتی لحاظ سے یہ انسان کو دو قسم کی جبلتوں کا مرکب سمجھتا ہے۔ ان میں سے کچھ تو حیوانی ہیں جو انسان اور حیوان میں مشترک ہوتی ہیں اور کچھ اعلیٰ جبلتیں ہیں (مثلاً مذہبی، اخلاقی، تحقیقی اور جمالیاتی) جو انسان ہی سے مخصوص ہیں اور اسے حیوانات سے الگ کرتی ہیں۔

فلسفیانہ نقطۂ نظر سے معاشرے کے دو پہلو ہیں۔ اولاً یہ افراد سے مرکب ہے، جن میں سے ہر ایک میں اعلیٰ اور ادنیٰ صفات موجود ہیں۔ ثانیاً بحیثیت مجموعی اس کی اپنی بہت سی صفات ہیں جو معاشرے کے مستقل وجود میں ہمیشہ پائی جاتی ہیں۔ مشہور صوفی شاعر مولانا روم نے یہ حقیقت ان الفاظ

میں بیان کی ہے ؎

رگ رگ است ایں آبِ شیریں و آبِ شور
در خلائق می رود تا نفخِ صُور

"بنی آدم کی رگوں میں میٹھا اور کھاری پانی اس وقت تک رواں رہے گا جب تک کہ اسرافیل صُور نہ پھونکیں۔"

اس شعر کا مصداق انسانی معاشرہ ہے جس کے بعض افراد میں کھاری پانی گردش کرتا ہے، یعنی ان میں بری صفات نمایاں ہوتی ہیں اور بعض افراد میں میٹھا پانی گردش کرتا ہے، یعنی ان میں اچھی صفات واضح ہوتی ہیں۔ یہ صورت اس وقت تک قائم رہے گی جب تک انسان کرۂ ارض پر موجود ہے۔ معاشرے کی اس کیفیت میں بعض افراد کے دنیا سے اٹھ جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تاہم انسان اور انسانی معاشرے کے ارتقاء سے معاشرے کا وجود ایک بہتر شکل اختیار کر لیتا ہے۔

اس نظریے کے مطابق تاریخ خود فطرت کی طرح ترقی کر رہی ہے اور حصولِ کمال کی سمت گامزن ہے۔ کمال کی جانب حرکت فطرت کے مظاہر کا لازمہ ہے اور تاریخ ان میں سے ایک ہے۔ تاریخ کی ترقی محض آلاتِ کار کی وضع اور مہارت استعمال اور تہذیب و تمدن کی پیشرفت تک ہی محدود نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک وسیع اور ہمہ جہتی عمل ہے جو ظاہری و باطنی تمام انسانی امور کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے گویا کہ ارتقائے تاریخ، انسان کو ماحول اور سماج کی بندشوں سے نجات دلانے کی جانب سرگرم عمل ہے اور انسان تاریخ کے ہمہ پہلو ارتقاء کے ساتھ ماحول کی زنجیروں سے اس طرح آزاد ہوتا ہے کہ وہ ان تنگ دائروں سے نکل کر عقیدے، ایمان اور نظریے کی وسیع تر دنیا

میں داخل ہو جائے گا۔

اس کے ساتھ ہی ایک عقیدے اور نظریے سے انسان کی وابستگی بڑھتی جا رہی ہے اور مستقبل میں وہ پوری طرح آزاد ہو کر عقیدے اور نظریے سے مکمّل وابستگی کے مرحلے تک پہنچ جائے گا۔ ماضی میں جب کہ انسان قدرتی وسائل سے خاطر خواہ فائدہ اٹھانے کے قابل نہیں تھا، وہ فطرت کا غلام تھا اور کوئی وقت آتا ہے کہ وہ قدرتی وسائل کو زیادہ سے زیادہ کام میں لا کر فطرت کی بندشوں سے آزاد ہو جائے گا بلکہ رفتہ رفتہ اس پر قابو پا کر اسے اپنے زیر تسلط کرے گا۔

یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ارتقاء ذرائع پیداوار میں ترقی کا نتیجہ ہوتا ہے جو لوگ یہ کہتے ہیں وہ علت کو معلول سے خلط ملط کرتے ہیں۔ درحقیقت ذرائع پیداوار میں ترقی تکامل، توسیع اور تنوّع کے لیے انسان کی قدرتی خواہش کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہ اس کی قوّتِ اختراع سے جنم لیتی ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ متواتر بڑھ رہی ہے۔

تاریخ کی انسانی یا فطری تعبیر کے مطابق انسان کی ایک خصوصیت اس کی حیوانی اور ملکوتی جبلتوں کے درمیان اندرونی اور انفرادی تضاد ہے یعنی وہ جبلتیں جن کا میلان پستی کی جانب ہوتا ہے، جو محدود، وقتی اور ذاتی فوائد حاصل کرنا چاہتی ہیں اور وہ جبلتیں جن کا میلان بلندی کی طرف ہوتا ہے جو انفرادی اور ذاتیاتی حدیں پار کر کے تمام عالمِ انسانیت کا احاطہ کرنا چاہتی ہیں اور اخلاقی، مذہبی، علمی اور عقلی مقاصد کا حصول ان کا نصب العین ہوتا ہے۔ مولانا روم فرماتے ہیں:

روح علم و حکمت کی طرف راغب ہوتی ہے۔
جسم باغوں اور میووں کی سمت مائل ہوتا ہے۔

روح ترقی اور بلندی کی جانب متوجہ ہوتی ہے۔
جسم مال اور ساز و سامان کی طرف بڑھتا ہے۔
روح زندگی اور جانداروں کی طرف مائل ہوتی ہے
کیونکہ اس کا مبداء روحِ لامکاں ہے۔
جسم سبزے اور بہتے ہوئے پانی کو چاہتا ہے
کیونکہ یہ انہی میں سے وجود پاتا ہے۔
اس کا ثبوت آیت "یحب ویحبونہ"[1] سے ملتا ہے۔

انسان کی اندرونی کشمکش جسے قدماء نے عقل اور نفس کے مابین جنگ کا نام دیا ہے، خود بخود بنی نوع انسان کے مختلف گروہوں کے درمیان آویزش پیدا کر دیتی ہے جس میں باکمال اور آزاد ذہن رکھنے والے ایک طرف اور بدطینت اور سنگدل لوگ دوسری طرف ہوتے ہیں۔

یہ نظریہ معاشرے میں کشمکش کے اصول کو تاریخی تغیر اور اس کے ارتقاء کے ایک حصے کے طور پر تسلیم کرتا ہے لیکن ایک ایسی طبقاتی جنگ کی شکل میں نہیں کہ جو پرانے ذرائع پیداوار اور پرانے سماجی نظام سے وابستہ لوگوں اور جدید ذرائع پیداوار سے متعلق لوگوں کے درمیان لڑی جائے۔ چنانچہ "انسانی نظریۂ تاریخ" یہ دعویٰ کرتا ہے کہ عقیدہ و ایمان میں پختہ اور ایک بلند مقصد کے حصول کے لیے کوشاں انسان جو نفسانی خواہشات اور حیوانی میلانات سے آزاد ہو چکا ہے اس کے اور ان پست فطرت اور حیوان صفت انسانوں کے درمیان نزاع اور کشمکش ہمیشہ جاری رہتی ہے جو

---

[1] سورۂ مائدہ - آیت ۵۴

تاریخی ارتقاء میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔

تاریخ کی تمام جنگوں کو قدیم وجدید طبقوں کی جنگ قرار دینا اس تمام عرصے میں انسانی زندگی کے بلند تر اور درخشاں مظاہر کی جانب سے آنکھیں بند کر لینے کے مترادف ہے۔

اس میں شک نہیں کہ طولِ تاریخ میں بہت سی جنگیں مادّی ضروریات مثلاً روٹی، کپڑے اور مکان کے حصول کی خاطر یا جنس، طاقت اور وقار کے لیے لڑی گئی ہیں لیکن بعض جنگیں ایسی بھی ہیں جنہیں حق و باطل اور نیکی و بدی کے درمیان معرکہ آرائی قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ جنگیں انسانی مقاصد اور حیوانی میلانات، اجتماعی مفاد اور ذاتی اغراض، اعلیٰ انسانی قدروں اور پست خواہشوں کے درمیان اور ہدایت یافتہ اور گمراہ لوگوں کے درمیان کشمکش کی آئینہ دار تھیں۔ قرآنی الفاظ میں اسے حزب اللہ و جند اللہ (اللہ کی فوج) اور حزب الشیطان و جند الشیطان (شیطان کی فوج) کے درمیان جنگ قرار دیا گیا ہے۔

اس نظریے کے حامی مادّہ پرستوں کی جانب سے تمام مذہبی، اخلاقی اور انسانی جنگوں کی تعبیر طبقاتی کشمکش کے طور پر کرنے کی بڑی شدت سے مذمت کرتے ہیں اور ایسی کوششوں کو تاریخ میں تحریف اور انسانی وقار کی توہین سمجھتے ہیں۔ تاریخی واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ ایسی بہت سی تحریکیں جو مادّی ضروریات کے حصول کے لیے چلائی گئیں ان کی قیادت اور رہنمائی یا کم از کم حمایت ایسے لوگوں نے کی جو خود خوشحال تھے اور اونچی حیثیتوں کے مالک تھے۔ جدلیاتی مادیت کے طرفدار یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ تمام ترقی پسندانہ تحریکیں ان مظلوم اور محروم طبقوں کی جانب سے چلائی جاتی ہیں جو مروجہ نظام

کو بدلنا چاہتے ہیں اور اس کی بجائے ایک ایسا نظام لانا چاہتے ہیں جو ترقی یافتہ ذرائع پیداوار کی بدولت ان کی مادی ضرورتوں کی تکمیل کر سکے۔ جدلیاتی نقطۂ نظر کے مطابق ہر شخص کا شعور اس کی معاشرتی حیثیت کی سطح پر ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے معاشرے کے طاقتور طبقے کا شعور لازمی طور پر موجودہ نظام کی حفاظت کا تقاضا کرتا ہے جب کہ فطری یا انسانی نظریۂ تاریخ اس بارے میں شواہد پیش کرتا ہے کہ ہر دور میں ارتقاء کی تحریکیں محروم اور مظلوم لوگوں ہی نے نہیں چلائیں بلکہ بعض اوقات خوشحال طبقے کے افراد نے اپنے وقت کے ظالمانہ نظام کو نوکِ خنجر سے چھید ڈالا اور بے دم کر دیا۔ اپنے اپنے وقت کے ظلم پر مبنی نظام کے خلاف حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت محمد مصطفیٰؐ اور حسینؑ بن علیؑ کی تحریکوں کی نوعیت ایسی ہی تھی۔ یہ کہنا بھی مغالطہ آمیز ہے کہ ترقی پسندانہ تحریکوں کے مقاصد ہمیشہ مادی رہے ہیں کیونکہ صدر اسلام کے مسلمانوں کی تحریک اس امر کی شاہد ہے کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اس تحریک کی ماہیت کی تشریح کرتے ہوئے امیر المومنین علیؑ نے فرمایا تھا: "وہ لوگ اپنی بصیرت تلواروں پر اٹھائے ہوئے تھے۔"[1]

اسی طرح یہ کہنا بھی غلط ہے کہ ترقی پسندانہ تحریکیں ہمیشہ پیداواری آلات کی ترقی کا نتیجہ رہی ہیں جیسے کہ گزشتہ دو صدیوں میں مشرق و مغرب میں آزادی کے حصول اور جمہوریت کے قیام کے لیے بہت سی تحریکیں چلائی گئیں۔ ایران کی تحریک مشروطیت ایک ایسی ہی تحریک تھی۔ غور کیجیے

---

[1] نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۴۸

کہ کیا ایران میں ذرائع پیداوار نے واقعی اتنی ترقی کر لی تھی کہ جس کے نتیجے میں وہاں کوئی معاشرتی کشمکش پیدا ہوئی اور اس نے تحریک مشروطہ کی شکل اختیار کر لی۔ اسی طرح معاشرے میں افتراق محض موجودہ قوانین کے ناقص اور ناکافی ہونے ہی سے پیدا نہیں ہوتا کہ جس سے انہیں تبدیل کرنے اور ان کی بجائے جدید قوانین رائج کرنے کی ضرورت لاحق ہو جائے بلکہ بعض اوقات مروّجہ قوانین پر عملدرآمد نہ ہونے کی وجہ سے بھی معاشرے میں بے چینی اور انتشار پیدا ہو جاتا ہے اور انہی قوانین پر عملدرآمد کرانے کے لیے تحریک چلانی پڑتی ہے۔ اموی اور عباسی خلفاء کے زمانے میں تحریکوں کی نوعیت ایسی ہی تھی۔ انسانی ضمیر اپنی اصلیت کو اس حد تک ضائع کر دینے والا نہیں ہے کہ ہمیشہ ذاتی مفاد اور مادی ضروریات کا غلام بنا رہے۔

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے اس سے ہم مندرجہ ذیل نتائج اخذ کر سکتے ہیں:

ارتقائی جنگیں

تاریخ میں مذکورہ لڑائیوں کی صورت، نوعیت اور سبب مختلف رہے ہیں۔ تاہم جو لڑائیاں تاریخ اور انسانیت کی ترقی کے لیے ممد و معاون ثابت ہوئیں ان میں ایک طرف تو وہ انسان تھے جو خود غرضی اور خود کامی سے آزاد، عقیدہ و ایمان کے پکے اور ایک مسلک کے حامل تھے۔ ان کے مقابلے میں بے مسلک، پست فطرت اور خود غرض لوگ تھے جو حیوانی صفات رکھتے تھے اور عقل و خرد سے عاری تھے۔

جن جنگوں نے تاریخی ارتقاء اور پیشرفت میں معاونت کی ہے،

ان کی ماہیت ان معنوں میں طبقاتی جنگ یا قدیم وجدید طبقوں کے مابین تصادم کی نہیں جس کا ذکر جدلیاتی مادیت کی بحث میں کیا گیا ہے۔ تاریخ کے گزشتہ اور آئندہ ادوار میں جنگوں نے بتدریج نظریاتی شکل اختیار کی اور کریں گی اور انسانی قدروں کے نقطۂ نگاہ سے انسان رفتہ رفتہ ایک مثالی معاشرے میں مثالی انسان کے مرحلہ کمال کے قریب ہوتا جارہا ہے۔ وہ اس راستے پر پیش قدمی کرتا رہے گا حتیٰ کہ دنیا میں ایک ایسی عالمگیر حکومت قائم ہو جائے گی جو انسانی قدروں کو حدِّ کمال تک پہنچائے گی۔ یہ ایک ایسا مرحلہ ہوگا جس پر پہنچ کر حکومت حق کی مخالفت، ظلم و جور، خود غرضی اور خود خواہی جیسی برائیوں سے پاک ہو جائے گی۔ اسلامی تعلیمات میں اس عالمی حکومت کو امام مہدی کی حکومت، کہا جاتا ہے۔

(ب) تاریخ کے مراحل

مادّیت پرستوں کا بیان کردہ تاریخی مراحل کا منطقی تسلسل سراسر بے بنیاد ہے اور تاریخی واقعات — بالخصوص گزشتہ ایک صدی کے واقعات — اس نظریے کی نامعقولیت کا واضح ثبوت ہیں۔ اس مدّت میں ان ممالک نے اشتراکیت کو اپنایا ہے جو سرمایہ دارانہ دور سے کبھی نہیں گزرے۔ روس، چین اور مشرقی یورپ کے ممالک اس حقیقت کی زندہ مثالیں ہیں۔ اس کے برعکس انگلستان، امریکہ اور فرانس جیسے ممالک جن میں بے حد ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ نظام قائم ہے، اس نظام پر بدستور عمل پیرا ہیں اور مادیت کے حامیوں کی ایک سو سال پرانی یہ پیشین گوئی کہ انگلستان اور فرانس جیسے ترقی یافتہ صنعتی ممالک میں محنت کشوں کے ہاتھوں انقلاب آجائے گا محض سراب ثابت ہوئی ہے۔

اس بیان سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ 'جبر تاریخ' کا کوئی وجود نہیں ہے اور اس امر کا قوی امکان ہے کہ ان سرمایہ دارانہ معاشروں میں پرولتاری طبقہ اتنا خوشحال ہو جائے کہ اس کے ذہن سے سرخ انقلاب کا تصوّر ہمیشہ کے لیے محو ہو جائے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ ایک واضح نظریے اور واضح عقیدے کے ظہور اور مذہبی اور معاشرتی شعور بلند ہو جانے سے ایک غیر مہذب معاشرہ ایک جست میں انسانی تہذیب کے نقطۂ عروج پر پہنچ جائے۔ آغاز اسلام کے دور کی کامیاب تحریک اس حقیقت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

(ج) مسلّح جدّوجہد کا تقدّس

مسلّح جدّوجہد کے جواز اور تقدّس کی وجہ محض کسی فرد یا قوم کے حقوق کا پامال ہونا ہی نہیں ہے بلکہ یہ جدوجہد ہر اس موقع پر جائز اور مقدس ہو جاتی ہے جب کسی ایسی چیز کو خطرہ لاحق ہو جسے انسان قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا ہو۔ جب کبھی کوئی حق اور بالخصوص وہ حق جس کا تعلق تمام تر انسانی معاشرے سے ہو معرضِ خطر میں پڑ جائے تو مسلّح جدّوجہد جائز ہے۔ 'آزادی' ایک ایسا ہی حق ہے اور مظلوموں کو ظالموں کے چنگل سے نجات دلانے کے لیے جدّوجہد جائز اور مقدّس ہے جس کا قرآن مجید میں بالصراحت ذکر کیا گیا ہے۔ اگر توحیدِ الٰہی کا عقیدہ جو عالمِ انسانیت کے لیے ایک بہترین سرمایہ ہے خطرے میں پڑ جائے تو اس کی حفاظت کے لیے ہر صورت میں لڑنا جائز ہو جاتا ہے۔

(د) اصلاحات

جزوی یا تدریجی اصلاحات کو رد کر دینے کی کوئی وجہ نہیں۔ اس لیے

کہ تاریخ ایک تضاد سے دوسرے تضاد تک پہنچنے کے لیے جبر و تعدی کی راہ سے نہیں گزرتی، لہٰذا یہ کہنا درست نہیں کہ جزوی اور تدریجی اصلاحات کشمکش کو روکتی ہیں اور تاریخ کے ارتقائی عمل میں رکاوٹ پیدا کرتی ہیں۔ جو افراد ایک صحیح اور منصفانہ مقصد کے لیے پست فطرت اور بد طینت لوگوں سے لڑتے ہیں، جزوی اور تدریجی اصلاحات بجائے خود ان کے لیے مددگار ثابت ہوتی ہیں اور تاریخ کی ارتقائی رفتار کو ان کی ضرورت کے مطابق تیز تر کر دیتی ہیں۔ اس کے برعکس بلوا، ہنگامہ آرائی اور خرابی سے مخالف قوتوں کو تقویت ملتی ہے اور صالح لوگوں کے حق میں تاریخ کی حرکت سست پڑ جاتی ہے۔ نظریہ مادیت کے برعکس، اس نظریے کے مطابق ایک دیگ میں اٹھنے والے ابال کی نہیں بلکہ ایسی نرم رو نشو و نما کی ضرورت ہے جس کی بدولت پھل درخت پر پکتا ہے۔ اس لیے درخت کی جتنی زیادہ حفاظت کی جائے اسے کیڑوں مکوڑوں سے بچایا جائے اور اس کی آبیاری کی جائے وہ اتنا ہی اچھا اور بعض اوقات قبل از وقت پھل دیتا ہے۔

(ہ) تفرقہ اندازی

جو اسباب جزوی اور تدریجی اصلاحات کو حق بجانب ثابت کرتے ہیں، وہی موجودہ معاشرتی عمل میں رکاوٹ اور بحران پیدا کرنے کے لیے تخریب کاری اور تفرقہ اندازی کو ناجائز ٹھیراتے ہیں۔

(و) مدّ و جزر تاریخ

گو مجموعی طور پر تاریخ ارتقا کی جانب حرکت کرتی ہے لیکن جدلیاتی نظریے کے برعکس یہ حرکت لازمی یا جبری نہیں ہے۔ یعنی یہ بھی ضروری

نہیں کہ ہر معاشرہ اپنی تاریخ کے ہر مرحلے کے مقابلے میں کامل تر ہوگا۔ چونکہ تاریخ کا اصلی محرک انسان ہے جو آزاد اور مختار ہونے کے سبب اپنے راستے کا انتخاب خود کرتا ہے لہٰذا تاریخ کی حرکت پذیری میں اتار چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے۔ کبھی یہ آگے بڑھتی ہے اور کبھی پیچھے ہٹتی ہے، کبھی اس کا جھکاؤ دائیں جانب ہوتا ہے اور کبھی بائیں جانب، کبھی اس کی رفتار تیز ہوتی ہے اور کبھی دھیمی ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات اس میں ایک مدّت کے لیے ٹھیراؤ آجاتا ہے۔ ایک معاشرے میں اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں۔ انسانی تہذیب نشیب و فراز، ترقی و انحطاط اور عروج و زوال کا ایک سلسلہ ہے جیسا کہ معروف مؤرخ ٹوئن بی نے کہا ہے:

> ہر تہذیب کا زوال ایک لازمی امر ہے گو بحیثیت مجموعی انسانی تاریخ ثابت قدمی سے ارتقا کی راہ پر آگے بڑھتی رہتی ہے۔

(ذ) طبیعی ماحول، اقتصادی حالات اور انفرادی و گروہی مفادات کی عائد کردہ بندشوں سے آزادی کی جانب بنی نوع انسان کے ارتقائی سفر کا نتیجہ ایک بامقصد زندگی، ایک مسلک، حکومت اور ایمان اور آئیڈیالوجی کی قوّت میں اضافے کی صورت میں نکلا ہے۔ ابتدائی دور کے انسان کے ارادے پر عموماً اس کے قدرتی اور معاشرتی ماحول اور حیوانی ہیجانات کی گہری چھاپ ہوتی تھی جب کہ آج کے متمدّن انسان نے اپنی تہذیبی اور تعلیمی پیشرفت اور جدید نظریات کی بدولت ان بندشوں سے ایک گونہ آزادی حاصل کر لی ہے اور اس نے آہستہ آہستہ ان پر قابو پا لیا ہے۔

(ح) جہاد اور امر بالمعروف، طبقاتی نزاع سے بالکل مختلف چیزیں ہیں کیونکہ ان کی بنیاد طبقات کی بجائے انسان کی ماہیت پر رکھی گئی ہے۔

(ط) فکری استدلال کی قوّت یعنی دلیل و برہان سے دوسروں کو قائل کرنے کی قوّت ایک تاثیر رکھتی ہے۔ بہ الفاظ دیگر انسان کے وجدان کی طاقت ایک اصالت رکھتی ہے۔ یہ ایک ایسی طاقت ہے جو اسے مادی احتیاجات پر حاکم بنا دیتی ہے۔ وجدان کی یہ طاقت خواہ فکری اعتبار سے ہو یا اعلیٰ انسانی میلانات کی صورت میں ظہور پذیر ہو۔ یہ انسان کو مادّہ پر حاکم بنا دیتی ہے۔

(ی) ہیگل اور مارکس کی Thesis-Antithesis اور Synthesis کی مثلث کا اطلاق نہ تاریخ پر ہوتا ہے اور نہ ہی فطرت پر، لہٰذا یہ ایک غلط مفروضہ ہے کہ تاریخ تضادات میں سے گزرتی ہے یا یہ کہ تاریخی مراحل تضادات کا ایک سلسلہ ہیں جو ایک دوسرے سے وجود میں آتے ہیں اور باہمد گر تبدیل ہو جاتے ہیں۔

مذکورہ مثلث کی بنیاد دو تبدیلیوں اور ایک ترکیب پر ہے یعنی ایک شے کا اپنی ضد میں تبدیل ہونا اور اس ضد کا ایک اور ضد میں تبدیل ہونا اور پھر پہلی دو شکلوں کا تیسرے مرحلے پر ترکیب میں جمع ہو جانا لیکن فطرت کا طریقِ کار ایسا نہیں ہے جو طریقہ فی الواقع فطرت میں موجود ہے وہ یا تو دو تضادات کا تبدیلی کے بغیر متحد ہونا ہے یا ایک تضاد کا کسی اتحاد کے بغیر دوسرے تضاد میں تبدیل ہونا ہے۔ تیسری شکل جو سامنے آتی ہے وہ کسی تبدیلی یا اتحاد کے بغیر ارتقاء ہے۔

بعض ایسے عناصر جو کسی حد تک ایک دوسرے سے متضاد ہوتے ہیں

اور اسی بنا پر ان کے لیے عناصر کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے ـــــ آپس میں متحد ہو جاتے ہیں لیکن ایک دوسرے میں تبدیل نہیں ہوتے، جیسے کہ پانی میں آکسیجن اور ہائیڈروجن گیس یکجا ہوتی ہے۔ ایسی صورتوں میں چیزوں کا اتحاد تو ہوتا ہے لیکن ایک چیز دوسری کی شکل میں تبدیل نہیں ہوتی۔ بعض دوسرے معاملات میں فطرت ایک انتہا سے دوسری انتہا کی طرف مائل ہو جاتی ہے اور اس عمل سے دونوں انتہاؤں میں اعتدال پیدا کر دیتی ہے۔ اس صورت میں ماہیت تو بدلتی ہے لیکن ترکیب اور ارتقاء نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ کئی ایک صورتیں ایسی بھی ہیں جن میں دو چیزوں کے اتحاد کے نتیجے میں ایک تیسری چیز وجود میں آجاتی ہے۔ بلاشبہ اگر ہم تیسری چیز کو "ترکیب" کہیں اور پہلی دو چیزوں کو بالترتیب "شے" اور "ضد شے" کا نام دیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن اس کے معنی اس کے علاوہ کچھ اور نہیں ہیں کہ ہم عام اور جانی پہچانی اصطلاحات استعمال کر رہے ہیں اور دو متضاد انتہاؤں یعنی تجاوز اور تناقص کے مابین نقطۂ اعتدال کو Synthesis سے اور پہلی دو حالتوں کو جو باہم متضاد ہیں Thesis اور Antithesis سے تعبیر کر رہے ہیں اور لفظ "ڈایا لیکٹک" کے استعمال کی بھی یہی صورت ہے۔ یہ ایک خوش آہنگ لفظ ہے اور کسی مصنف کے لیے اس سے صرف نظر کرنا مشکل ہے۔ لہٰذا اگر یہ لفظ کسی ایسے ذہنی خاکے کے بارے میں استعمال کیا جائے جس میں حرکت اور تضاد کے اصول یکجا کر دیے گئے ہوں تو اس میں کوئی حرج نہیں، خواہ، اس میں جدلیاتی طرز کی وہ امتیازی خصوصیات موجود نہ ہوں جن کی جانب ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں۔

انسان کے بارے میں دو تصوّر

تاریخ کی ارتقائی حرکت کے متعلق مندرجہ بالا دو نظریات انسان، اس کی حقیقی شناخت اور اس کی پوشیدہ صلاحیتوں کے متعلق دو تصوّرات کا نتیجہ ہیں۔

پہلے تصوّر کے مطابق انسان اپنے مادی مفادات کا اسیر ہے اور اس کے تمام افعال بلا استثناء ذرائع پیداوار اور اقتصادی حالات کے جبر کے تحت انجام پاتے ہیں۔ اس کا ضمیر، اس کی افتادِ طبع، اس کی بصیرت، اس کے خیالات اور اس کے انتخابات سب کے سب اس کے فطری اور معاشرتی ماحول کا پرتو ہیں جن کے آگے وہ سرِ مو سرتابی نہیں کر سکتا۔

دوسرے تصور کے مطابق انسان سرشت الٰہی کا مالک ہے، وہ ایک حق طلب اور حق پسند فطرت سے آراستہ ہے۔ اسے اپنے آپ پر اختیار حاصل ہے اور وہ فطرت، ماحول، سرشت اور مقدر کے جبر سے آزاد ہوتا ہے۔ انسان کے بارے میں اس تصور کے مطابق انسانی قدریں اس کی سرشت میں شامل ہیں یعنی وہ پوری قوّت کے ساتھ اہم ضرورتوں کے ایک سلسلے کی شکل میں اس کی طبیعت میں رکھ دی گئی ہیں اور اپنی سرشت کے مطابق انسان اعلیٰ انسانی اقدار کا دلدادہ ہے۔ بہ الفاظ دیگر وہ حق، حقیقت، عدالت اور بہترین اخلاق کا طلب گار ہے اور اپنی عقل کی قوّت سے اپنے معاشرے کی منصوبہ بندی کرتا ہے۔ وہ اپنے ماحول کی اندھا دھند تقلید نہیں کرتا بلکہ اپنے ارادے اور قوّت انتخاب کی بدولت اپنے ذہنی منصوبوں پر عمل درآمد کرتا ہے۔ وحیٔ الٰہی اس کی انسانی قدروں کی رہبر اور محافظ

کے طور پر اس کو مدد دیتی ہے اور اس کی رہنمائی کرتی ہے۔

انسان کا اثر ماحول پر بھی پڑتا ہے چونکہ انسان آزاد ہے اور اپنے ماحول پر اس کی گرفت مضبوط ہے اس لیے اپنے گرد و پیش کے حالات کے بارے میں اس کا روّیہ ایک مجبورانہ ردِّ عمل نہیں ہوتا بلکہ اس جہت سے کہ انسان ایک باخبر، آزاد، مختار، صاحبِ ارادہ اور اعلیٰ خصوصیات کا حامل مظہر ہے۔ وہ ماحول کے غلام اور بے بہرہ ایک حیوان کے مقابلے میں نپے تلے اور سوچے سمجھے انداز میں افعال بجا لاتا ہے۔

انسان کی ذاتی خصوصیت اور اس کا اصلی جوہر کہ جو حقیقت میں انسانیت کا معیار ہے، وہ انسان کی اپنے نفس اور اس کی برائیوں پر قابو پانے کی صلاحیت ہے۔ طول تاریخ میں انسانی زندگی کی روشن مثالیں اس کی اسی خصوصیت کی بدولت ظاہر ہوتی ہیں لیکن مادیت پرستوں نے انسان کی اس استعداد کو جو انسانی زندگی کا ایک بے حد درخشاں پہلو ہے یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔

قرآنی تصوّر

بلاشبہ قرآن مجید تاریخ کی تعبیر ایک دوسرے نظریے کی بنیاد پر کرتا ہے۔ قرآنی نقطہ نگاہ کے مطابق ایک طرف حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد مصطفیٰؐ ایسے صالح اشخاص اور ان کے ایمان دار پیروؤں اور دوسری طرف نمرود، فرعون، یہودی جابروں اور ابوسفیان جیسے لوگوں کے مابین ایک ازلی اور ابدی جنگ جاری رہی۔ مثل مشہور ہے کہ "ہر فرعونے را موسیٰؑ"۔

مولانا رومؒ فرماتے ہیں:

دو علَم افراخت اسپید و سیاہ
آن یکی آدم دگر ابلیس راہ
درمیانِ آن دو لشکرگاہ زفت
چالش و پیکار، آں چہ رفت رفت
ہم چنیں دورِ دوم ہابیل شد
ضدِ نور پاک او قابیل شد
ہم چنیں ایں دو علَم از عدل و جَور
تا بہ نمرود آمد اندر دوَر دوَر
ضد ابراہیم گشت و خصم او
واں دو لشکر کیں گزار و جنگجو
چوں درازی جنگ آمد ناخوشش
فیصل آں ہر دو آمد آتشش
دوَر دوَر و قرن قرن ایں دو فریق
تا بہ موسیٰؑ و بہ فرعون غریق
ہم چنیں تا دَور عہد مصطفیٰؐ
با ابوجہل آں سیہ دار جفا

حق اور باطل کی قوّتوں کے مابین جنگ میں فتح کبھی پہلے گروہ کو نصیب ہوتی ہے اور کبھی دوسرے کو۔ بہرحال یہ کامیابیاں اور ناکامیاں کئی ایک معاشرتی، اقتصادی اور اخلاقی عوامل کا نتیجہ ہیں۔ قرآن مجید اخلاقی عوامل کے اثرات کی اہمیت کو نمایاں کرتا ہے اور یوں تاریخ کو ایک سرچشمۂ ہدایت میں تبدیل کر دیتا ہے۔

اگر تاریخ کو محض اتفاقی واقعات کا ایک سلسلہ سمجھ لیا جائے جن کی پشت پر کوئی واضح سبب موجود نہ ہو تو ان واقعات کی حیثیت فقط ایک افسانے کی ہو گی جو تفریح کا سامان تو مہیا کر سکتا ہے لیکن ہدایت اور نصیحت کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔

اگر ہم یہ بات تو تسلیم کریں کہ تاریخ کے کچھ مقررہ قواعد وضوابط ہیں لیکن یہ خیال کریں کہ اس کا رخ متعین کرنے میں انسانی ارادے کا کوئی دخل نہیں ہے اس صورت میں تاریخ کو علمی طور پر تو سبق آموز کہا جا سکتا ہے لیکن عملی طور پر اس کی کوئی قیمت نہیں ہو گی۔ اس شکل میں یہ اتنی ہی سبق آموز ہو گی جتنے کہ بعید ترین کہکشاں میں رونما ہونے والے حوادث ہو سکتے ہیں جن کے متعلق ہم خواہ کتنا ہی علم رکھتے ہوں لیکن ان کا راستہ متعین کرنے یا تبدیل کرنے میں کوئی کردار ادا نہیں کر سکتے۔

اگر ہم اس بات کو تسلیم کر لیں کہ تاریخ قطعی قواعد وضوابط کے تابع ہے اور انسان بھی اس میں مؤثر کردار ادا کرتا ہے لیکن یہ خیال کریں کہ اس کے باوجود فیصلہ کن عامل دولت، طاقت یا علم ہے تو پھر تاریخ بلا شبہ سبق آموز ہو گی لیکن اس کی حیثیت ایک مضر چیز کی سی ہو گی۔ اگر علم کو ایک فیصلہ کن عامل نہیں بلکہ طاقت کے حصول کا ذریعہ سمجھا جائے تب بھی نتیجہ وہی ہو گا۔

تاہم اگر تاریخ کو قطعی ضوابط کے تابع سمجھیں اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کریں کہ انسانی ارادہ معاشرے کے فائدے کی خاطر اس (یعنی تاریخ) کا رخ معین کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے تو فقط اس صورت میں تاریخ اور اس کا مطالعہ سبق آموز اور مفید ہو گا۔ قرآن مجید تاریخ کو اسی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ جن لوگوں کو رجعت پسند کا نام دیا جاتا ہے قرآن مجید میں انہیں مقتدر،

خود پسند اور عیاش کہا گیا ہے اور جو لوگ اپنے حقوق کی خاطر لڑتے ہیں انہیں مظلوم قرار دیا ہے۔ قرآنی نقطۂ نظر کے مطابق ابتدائے تاریخ سے جو دائمی کشمکش جاری ہے اور جو معاشرے کی ترقی میں معاون ثابت ہوئی ہے اس کی نوعیت مادّی نہیں بلکہ اخلاقی اور انسانی ہے۔ اندریں صورت وہ طبقاتی جنگ ہرگز نہیں ہے۔

مثالی معاشرہ

امام مہدیؑ کے ظہور اور ان کے ہاتھوں ایک عالمی انقلاب برپا ہونے کی امید ایک ولولہ انگیز اسلامی معاشرتی تصوّر ہے مستقبل پر اعتماد کے علاوہ یہ ایک ایسا موزوں آئینہ ہے جس میں اسلامی آرزوؤں کی ماہیت کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اس پیشگوئی میں کئی ایک عناصر شامل ہیں جن میں سے کچھ فلسفی، ثقافتی، سیاسی، اقتصادی، معاشرتی اور کچھ انسانی، فطری اور اسلامی ہیں۔

اس مختصر سے مقالے میں اس موضوع پر مفصّل بحث کرنا یا قرآنی آیات اور احادیث نقل کرنا ممکن نہیں ہے۔ تاہم اس "انتظارِ عظیم" کی ماہیت واضح کرنے کے لیے ہم اس کی نمایاں خصوصیتوں پر مختصراً روشنی ڈالتے ہیں جو حسب ذیل ہیں:

بنی نوع انسان کے مستقبل کے بارے میں رجائیت

انسان کے مستقبل کے بارے میں لوگوں کی مختلف آراء ہیں بعض اشخاص

یہ سمجھتے ہیں کہ تباہی، بربادی، ہنگامہ اور فساد انسان کا مقدر ہے اور اس بنا پر زندگی بیکار چیز ہے۔ ان کے خیال میں سب سے عاقلانہ فعل یہ ہے کہ زندگی کو ختم کر دیا جائے۔ کچھ اور لوگ بنیادی طور پر انسانی زندگی کو ابتر سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ حیرت انگیز صنعتی ترقی اور تباہ کن اسلحہ کی تیاری کی بنا پر انسان ایک ایسے مرحلے پر پہنچ چکا ہے کہ وہ اپنے ہاتھوں کھودے ہوئے گڑھے سے صرف ایک قدم کے فاصلے پر ہے یعنی مکمل تباہی کے قریب ہے۔

برٹرینڈ رسل، اپنی کتاب "نئی امیدیں" New Hopes میں لکھتا ہے کہ آئن سٹائن سمیت کچھ لوگ ایسے ہیں جو یہ رائے رکھتے ہیں کہ ممکنہ طور پر انسان نے اپنی زندگی کا دور ختم کر لیا ہے اور شائد وہ اپنی حیرت انگیز سائنسی ترقی کے ذریعے چند سالوں میں اپنے آپ کو نیست و نابود کر لے گا۔ اس نظریے کے مطابق عین اس وقت کہ جب نسل انسانی اپنی عمر کا آدھا راستہ طے کر چکی ہے اور تہذیبی پختگی حاصل کرنے کو ہے، اس کے بالکل معدوم ہو جانے کا بہت قوی امکان ہے۔ اگر ہم فقط ظاہری شہادتوں پر انحصار کریں تو اس امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا۔

ایک تیسرے نظریے کے مطابق تباہی اور ہنگامہ آرائی فطرت انسانی کا جزو نہیں ہے اور نہ کبھی اجتماعی خودکشی کا سانحہ رونما ہوگا۔ اس نظریے کے مطابق انسان کا مستقبل حقیقتاً بڑا خوشگوار اور شاندار ہے کیونکہ ایک عظیم انسان ظاہر ہونے والا ہے جو تمام برائیوں اور خرابیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے گا۔ اس سے درج ذیل نتائج برآمد ہوں گے:

(۱) اس نظریے کی بنیاد مذہب پر ہے اور اسی سیاق و سباق میں اسلام

مہدیؑ موعودؑ کے ظہور اور ان کے توسط سے ایک عالمگیر انقلاب کی نوید دیتا ہے۔

(ب) دولت و طاقت، تغلب و تسلط، ظلم و جبر اور مکر و فریب پر نیکی و پرہیزگاری، امن و آشتی، عدل و انصاف اور حق و صداقت کو بالآخر فتح حاصل ہوگی۔

(ج) رنگ و نسل اور علاقہ و خطہ کی بنیاد پر بٹے ہوئے بنی نوع انسان ظالم، جابر اور خائن حکومتوں سے آزادی حاصل کرلیں گے اور عدل و انصاف پر مبنی ایک عالمی حکومت کے توسط سے اسلام کے پرچم تلے متحد ہو جائیں گے۔

(د) ساری دنیا کی از سر نو آبادکاری اس طرح کی جائے گی کہ زمین کا کوئی حصہ بے آباد اور بنجر نہیں رہے گا۔

(ہ) بنی نوع انسان کا مکمّل شعور حاصل کر کے ایک نظریے اور عقیدے سے وابستہ ہونا نیز حیوانی ہیجانات اور ناروا معاشرتی بندشوں سے رہائی پا کر کامل آزادی سے بہرہ ور ہو جانا۔

(و) تمام بنی نوع انسان میں دولت اور املاک کی مساوی تقسیم اور زمین سے حاصل ہونے والی نعمتوں سے سب کو فائدہ اٹھانے کا حق ملنا۔

(ز) زنا، سود خوری، غدّاری، چوری اور قتل ایسے جرائم کا مکمّل خاتمہ اور منشیات کی قطعی بندش کا عمل میں آنا نیز غیر معمولی دماغی الجھنوں اور بغض و عناد کا نابود ہونا۔

(ح) کرۂ ارض سے جنگ کا مکمل خاتمہ اور تعاون، صلح، دوستی اور محبت کا دور دورہ ہونا۔

(ی) انسان اور فطرت کے مابین مکمل ربط کی نمود۔

یہ تمام نکات مفصل بحث اور تجزیے کے متقاضی ہیں لیکن یہاں قارئین کو فقط اسلامی امنگوں کی ماہیت سے آگاہ کرنا مقصود ہے۔

عظیم انتظار

اس کے معنی یہ ہیں کہ اس (مذکورہ بالا) نظام کے حقیقت بننے اور پنپنے کی امید رکھی جائے جو ارادۂ خداوندی میں دنیا کے لیے مقدر کیا جا چکا ہے۔

اب ہم پہلی بات کی جانب لوٹتے ہیں کہ انتظار کی دو قسمیں ہیں۔ اس کی ایک قسم تعمیری اور موثر ہوتی ہے جو ایک عبادت بلکہ افضل عبادت ہے جب کہ دوسری قسم تخریبی اور مفلوج کر دینے والی ہوتی ہے جو بے کارِ محض اور ایک طرح کی عیاشی ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں انتظار کی یہ دو قسمیں "مہدیؑ موعود" کے عظیم ظہور کے بارے میں دو مختلف تصورات کا نتیجہ ہیں اور یہ ہر دو تصور، تاریخ کے ارتقاء کے بارے میں دو مختلف نظریوں سے ابھرے ہیں اب ہم انتظار کی ان دونوں قسموں کی مزید وضاحت کرتے ہیں اور اس کی ابتدا تخریبی انتظار کے متعلق بحث سے کرتے ہیں۔

تخریبی انتظار

بعض ظاہر بین لوگوں کے خیال کے مطابق مہدی کے قیام اور ان کے لائے ہوئے انقلاب کی نوعیت ایک "دھماکے" ایسی ہوگی۔ ان لوگوں کا نظریہ، یہ ہے کہ مہدیؑ کے ظہور کا انحصار نا انصافی، امتیاز، مایوسی اور تباہی کے پھیل جانے پر ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ مہدی کے ظہور سے تھوڑی مدّت

پہلے بدی کی قوتیں دنیا پر مکمل طور پر چھا جائیں گی اور ایک بھی نیک آدمی زندہ نہیں رہے گا۔ وہ ایک اچانک دھماکے کے منتظر ہیں جس کے نتیجے میں حق کا بول بالا ہوگا لیکن حق کے پرستاروں کا نہیں، کیونکہ ان میں سے تو کوئی موجود ہی نہ ہوگا۔ اس بنا پر وہ ہر اصلاح کی مذمت کرتے ہیں اور ہر گناہ، ظلم اور زیادتی کو جائز اور مناسب سمجھتے ہیں کیونکہ ان کا خیال ہے کہ فساد اور ظلم کے نتیجے میں دھماکے کا وقت قریب تر ہو جائے گا۔ وہ اس اصول کے قائل ہیں کہ نتائج سے وسائل کا جواز ثابت ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اگر مقصد دل پسند ہو تو اس کے حصول کے ناجائز ذرائع بھی جائز ہو جاتے ہیں۔ اسی بنا پر گھناؤنے جرائم عیش و عشرت کا ذریعہ ہونے کے علاوہ مقدس انقلاب کے برپا ہونے کے لیے بھی ممد و معاون تصور کیے جاتے ہیں۔ ان لوگوں کا نقطۂ نظر ان الفاظ میں واضح کیا جا سکتا ہے ؏

اس بت کے من کو جینے جیسے بھی بن پڑے
ممکن نہیں جو نیکی تو جائز بدی بھی ہے

اس قسم کے لوگ مصلحین اور ایسے لوگوں سے نفرت کرتے ہیں جو نیک کام کرنے اور برائیوں سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں کیونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ایسے اقدامات سے مہدیٔ موعودؑ (عجل اللہ تعالےٰ فرجہ) کے ظہور میں تاخیر ہوتی ہے۔ اگر وہ خود برائیوں کا ارتکاب نہ بھی کریں تب بھی وہ کم از کم گنہگاروں کی قابل نفرت سرگرمیوں کو ضرور سراہتے ہیں کیونکہ ان کے خیال کے مطابق اگر برے کام کیے جائیں تو مہدی کے ظہور کے لیے میدان ہموار ہوتا ہے۔

نیم جدلیاتی نظریہ

مذکورہ بالا نظریے کو نیم جدلیاتی کہا جاسکتا ہے کیونکہ یہ تخریب اور فساد کو مقدس انقلاب کا پیش خیمہ سمجھتا ہے۔ جدلیاتی طرزِ فکر بھی جزوی اصلاحات کی مخالفت کرتا ہے اور بے چینی پیدا کرنے کو جائز تصوّر کرتا ہے لیکن اس میں کچھ خوبی بھی ہے کیونکہ اس کی نگاہ میں یہ سب کچھ اس لیے جائز ہے کہ اس سے مخالفت کی خلیج وسیع ہوتی ہے اور کشمکش میں شدت آتی ہے۔ تاہم جہاں تک مذکورہ بالا شرمناک نظریے کا تعلق ہے اس کے پیرو فقط فساد اور افراتفری کو صحیح گردانتے ہیں اور پھر چپ سادھ لیتے ہیں اور یہ امید رکھتے ہیں کہ مطلوبہ نتائج خود بخود برآمد ہو جائیں گے۔ یہ امر واضح ہے کہ مہدیؑ موعود کے بارے میں اس قسم کا نظریہ، اسلامی عقائدؑ کے خلاف ہے اور اسے محض ذہنی عیاشی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

تعمیری انتظار

قرآن مجید کی تمام آیات جو مہدی کے تصوّر کی بنیاد فراہم کرتی ہیں اور وہ سب روایات جو اس کی تائید میں نقل کی گئی ہیں مذکورہ بالا نظریے کے خلاف ہیں۔ جو کچھ قرآن مجید سے مستنبط ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ مہدی کا ظہور اچھے اور بُرے لوگوں کے درمیان کشمکش کے سلسلے کی ایک کڑی ہے اور مہدی اہل حق کی مکمل قطعی اور آخری فتح کا نشان ہیں۔

قرآن مجید فرماتا ہے:

"جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کیے، اللہ

ان سے وعدہ کرتا ہے کہ وہ انہیں روئے زمین پر اپنا وارث
بنائے گا، جیسے کہ اس نے ان سے پہلے لوگوں کو وارث بنایا
اور وہ ان کے لیے ان کا دین قائم کرے گا جو اس نے
ان کے لیے پسند فرمایا ہے اور وہ یقیناً خوف کی حالت کو
اطمینان کی حالت میں بدل دے گا۔" (سورۂ نور۔ آیت ۵۵)

مہدی کا ظہور مظلوموں اور کمزوروں پر اللہ کا احسان ہے اور ان کے حکومت سنبھالنے اور تمام روئے زمین پر اللہ کا وارث بننے کا ذریعہ ہے۔

قرآن مجید مزید فرماتا ہے :

"جو لوگ زمین پر مظلوم تھے ہم ان پر احسان کرنا اور انہیں
پیشوا اور وارث بنانا چاہتے ہیں۔" (سورۂ قصص۔ آیت ۵)

مہدیٔ موعود کا ظہور اللہ کے اس وعدے کا پورا ہونا ہے جو اس نے صالح لوگوں سے اپنی مقدس کتابوں میں کر رکھا ہے کہ زمین انہی کی ملکیت ہے اور آخر کار وہی اس کے مالک ہوں گے۔

"ہم نے توریت کے بعد زبور میں بھی لکھ دیا تھا کہ زمین کے
وارث ہمارے نیک بندے ہوں گے۔" (سورۂ انبیاء۔ آیت ۱۰۵)

"ساری زمین خدا کی ہے، وہ جسے چاہے اس کا مالک بنائے
اور عاقبت تو بس متقی لوگوں کے لیے ہے۔" (سورۂ اعراف۔ آیت ۱۲۸)

رسولِ اکرمؐ کی ایک معروف حدیث ہے:

"اللہ زمین کے ظلم و جور سے پر ہو جانے کے بعد اسے
عدل و انصاف سے معمور کر دے گا۔"

یہ حدیث بھی ہمارے دعوے کی تائید کرتی ہے نہ کہ دوسرے گروہ کی،

اس میں ظلم کو بنیاد بنایا گیا ہے اور ظالموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے نتیجے میں مظلوموں کے ایک گروہ کی موجودگی واضح ہوتی ہے جو حمایت کے مستحق ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو کچھ بعید نہیں کہ اللہ زمین کو توحید، ایمان اور نیکی سے بھر دے گا جب کہ وہ کفر، شرک اور فساد سے بھر چکی ہوگی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مظلوم طبقہ ضرور موجود ہوگا۔ اس صورت میں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قیام مہدیؑ کھوئے ہوئے حق کے لیے ہوگا نہ کہ اہل حق کے گروہ کے لیے خواہ وہ اقلیت میں ہی کیوں نہ ہو۔

شیخ صدوق، امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ مہدیؑ اس وقت ظاہر ہوں گے، جب صالح لوگ بہت صالح اور برے لوگ بہت بُرے ہو جائیں گے۔ اس روایت سے بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ ظہور مہدیؑ کے وقت اچھے اور برے دونوں قسم کے لوگ موجود ہوں گے۔

اسلامی روایات کے مطابق لوگوں کا ایک طبقہ ظہور مہدیؑ پر فی الفور ان کے ساتھ شامل ہو جائے گا۔ ان روایات سے بھی پتا چلتا ہے کہ صالح لوگ بالکل ختم نہیں ہو جائیں گے اور گو ان کی تعداد کتنی ہی کم کیوں نہ ہو، وہ ایمان کے عالی ترین درجات پر فائز ہوں گے اور ان کو امام حسین علیہ السلام کے اصحاب کے مقام پر شمار کیا جا سکے گا۔ اسلامی روایات کے مطابق قیامِ مہدیؑ سے پہلے بھی کچھ صالح لوگ قیام کریں گے۔ مثال کے طور پر یمانی کے قیام کا ذکر کیا گیا ہے۔

آخر میں ہم یہ کہیں گے کہ آیات قرآنی اور اسلامی روایات سے بہ حیثیت مجموعی معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی ابتدا سے خیر و شر کے درمیان جنگ

جاری ہے۔ اس کا آخری معرکہ امام مہدیؑ کا قیام ہوگا۔ یہ امام مہدیؑ ہی ہیں جو انبیائے کرامؑ، اولیاء اللہ اور مجاہدین کے نصب العین کو ایک حقیقت بنا کر دکھائیں گے۔

ضمیمہ

امام مہدی علیہ السلام کے وجود، ظہور اور قیام کے بارے میں واضح اور صریح حدیثیں اہل سنت کی مندرجہ ذیل کتب میں دیکھی جا سکتی ہیں:

۱۔ صحیح بخاری ۲۔ صحیح مسلم ۳۔ سنن ترمذی ۴۔ سنن ابو داؤد ۵۔ سنن ابن ماجہ ۶۔ مسند احمد بن حنبل ۷۔ مستدرک حاکم ۸۔ کتاب الفتن، ابو الشیخ ۹۔ تاریخ بن عساکر ۱۰۔ کتاب الفتن، ابن حماد ۱۱۔ مسند حارث بن علی ۱۲۔ تاریخ خطیب بغدادی ۱۳۔ المصنّف، ابن ابی شیبہ ۱۴۔ الملاحم، ابن المنادری ۱۵۔ کتاب الفتن، ابو غنام کوفی ۱۶۔ طبقات ابن سعد ۱۷۔ تفسیر ابن جریر ۱۸۔ عقد الدرر فی اخبار المنتظرؑ، یوسف بن یحییٰ مقدسی ۱۹۔ تاریخ کامل، ابن اثیر ۲۰۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید معتزلی ۲۱۔ البیان فی اخبار صاحب الزمان، حافظ محمد بن یوسف گنجی ۲۲۔ فصول المہمہ، ابن صبّاغ مالکی ۲۳۔ الحاوی، حافظ سیوطی ۲۴۔ عرف الوردی، حافظ سیوطی ۲۵۔ الکشفان، حافظ سیوطی ۲۶۔ اخبار المہدیؑ حافظ ابو نعیم ۲۷۔ المعجم، طبرانی، ۲۸۔ نور الابصار، شبلنجی ۲۹۔ اسعاف الراغبین، محمد بن علی الصبان ۳۰۔ تذکرہ، القرطبی ۳۱۔ منہاج السنہ، ابن تیمیہ ۳۲۔ فتح الباری حافظ ابن حجر ۳۳۔ شرح مواہب زرقانی ۳۴۔ التوضیح فی التواتر، شوکانی ۳۵۔ المہدیؑ، ابو الاعلیٰ عراقی، ۳۶۔ صواعق محرقہ، ابن حجر مکی ۳۷۔ مہدی المنتظرؑ، عبداللہ ابن محمد ۳۷۔ المنار، ابن قیم الایضاح، صدیق حسن خاں ۳۸۔ المنتقی، حافظ ذہبی۔

امام مہدی علیہ السلام کے بارے میں واضح صریح حدیثیں درج ذیل شیعہ کتب میں موجود ہیں:

۱۔ الکافی، شیخ کلینی ۲۔ الغیبت، محمد بن ابراہیم نعمانی ۳۔ علل الشرائع شیخ صدوق

۴۔کمال الدین، شیخ صدوق ۵۔عیون اخبار الرضا، شیخ صدوق ۶۔نہج البلاغہ، شریف رضی ۷۔الارشاد، شیخ مفید ۸۔الغیبت، شیخ ابوجعفری طوسی ۹۔دلائل الامامت، ابوجعفر محمد طبری ۱۰۔مجمع البیان، فضل محمد حسن طبرسی ۱۱۔الاحتجاج، ابومنصور احمد طبرسی ۱۲۔وسائل الشیعہ، شیخ حر عاملی ۱۳۔بحار الانوار، علامہ مجلسی ۱۴۔انوار النعمانیہ، سید نعمت اللہ جزائری ۱۵۔کفایت الموحدین، اسماعیل طبرسی ۱۶۔نجم الثاقب، میرزا حسین طبرسی ۱۷۔منتخب الاثر، شیخ لطف اللہ گلپائگانی ۱۸۔سفینۃ البحار، شیخ عباس قمی ۱۹۔عقائد الامامیہ، شیخ محمد رضا مظفر ۲۰۔اعیان الشیعہ، سید محسن الامین ۲۱۔علی والوصیت، شیخ نجم الدین عسکری ۲۲۔الملاحم سید ابن طاؤس ۲۳۔علم الحشرات، ڈاکٹر شجاعی ۲۴۔غایت المرام، سید ہاشم البحرانی، ۲۵۔المہدی الموعود المنتظر، محمد رفیع حسین معرفی ۲۶۔الامام المہدی وظہورہ، سید حسین الحسینی شاہرودی ۲۷۔کشف الغمہ، علی بن عیسیٰ اربلی ۲۸۔الدروس، شہید اوّل محمد بن مکی ۲۹۔منتخب انوار المضیہ، سید علی الفخّار ۳۰۔کفایت الاثر، خزّاز رازی۔

مذکورہ بالا شیعہ وسنی کتب میں امام مہدی علیہ السلام کے بارے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ۵۰ صحیح حدیثیں آنحضرتؐ کے صحابہ سے مروی ہیں، جن میں سے بعض کے اسمائے گرامی یہ ہیں: ۱۔علی بن ابیطالب ۲۔ام المومنین ام سلمہ ۳۔ام المومنین عائشہ ۴۔ام المومنین ام حبیبہ ۵۔عبداللہ بن مسعود ۶۔عبداللہ بن عباس ۷۔عبداللہ بن عمر ۸۔عبداللہ بن عمرو عاص ۹۔سلمان فارسی ۱۰۔حذیفہ بن یمان ۱۱۔جابر بن عبداللہ انصاری ۱۲۔ابوایوب انصاری ۱۳۔عثمان بن عفان ۱۴۔ابوسعید خدری ۱۵۔ابوھریرہ ۱۶۔ابوامامہ باہلی ۱۷۔انس بن مالک ۱۸۔ابوطفیل ۱۹۔ثوبان ۲۰۔علی ہلالی ۲۱۔مجمع بن جاریہ انصاری ۲۲۔ابوسلیمان ۲۳۔شہر بن حوشب ۲۴۔عبدالرحمٰن بن عوف ۲۵۔عباس بن عبدالمطلب ۲۶۔عمار بن یاسر ۲۷۔عوف بن مالک ۲۸۔عمران بن حصین ۲۹۔جابر بن سمرہ ۳۰۔تمیم داری

ہماری مطبوعات

اسلام دینِ فطرت
اسلام دینِ مُعاشرت
اسلام دینِ معرفت
اسلام دینِ حکمت
فلسفۂ مُعجزہ
فلسفۂ شہادت
فلسفۂ ولایت
فلسفۂ حجاب
فلسفۂ احکام
تاریخِ عاشورا
گفتارِ عاشورا
بنائے کربلا
مرگِ گُل رنگ
مکتبِ اسلام
مکتبِ رسولؐ
مکتبِ تشیّع
آخری فتح
انتظارِ امامؑ
توضیح المسائل اردو
توضیح المسائل فارسی
شریعت کے احکام

کتابُ الدعاء والزیارات
اعمالِ حج
حکایاتُ القرآن
حیاتِ انسان کے چھ مرحلے
مقالاتِ مطہری
بُت شکن
مردِ انقلاب
ہار جیت
بہلول عاقل
فُزْتُ بِرَبِّ الکعْبَۃِ
سخن
ابُوطالب۔ مظلومِ تاریخ
تفسیر سورۂ حمد
شرح قرآن
سِیر و سُلوک
یَسَّرْنَا القرآن
غدیر کی برکتیں
تعلیماتِ اسلامی
حدیثِ کِساء
دُعائے کُمَیلؒ

نیز بچوں کے لیے دل چسپ مذہبی کہانیاں بھی دستیاب ہیں!

جامعہ تعلیماتِ اسلامی پاکستان